کورس: پاکستانی زبانیں وادب-II (4658)

سمسٹر: خزاں 2019ء

امتحانی مشق نمبر 1

یونٹ (1 تا 4)

سوال نمبر 1- پشتو زبان میں قدیم دور کی نظم ونثر کا احوال تحریر کریں۔ (20)

سوال نمبر 2- پشتو زبان کس طرح سے وجود میں آئی نیز پشتو زبان کی لوک شاعری اور کلاسکی شاعری کی خصوصیات تحریر کریں۔ (20)

سوال نمبر 3- پنجابی زبان میں شاعری کی ارتقا پر تفصیلی نوٹ تحریر کریں۔ (20)

سوال نمبر 4- پنجابی زبان میں کہانی کا ارتقا کس طرح سے ہوا، نیز پنجابی کہانی میں جدید رجحانات کی تفصیل تحریر کریں۔ (20)

سوال نمبر 5- پشتو زبان کے جدید نظم ونثر کا احوال تحریر کریں۔ (20)

Q.NO.01

مکتب فکر سے ہوتا ہے۔ بایزید انصاری نے خیر البیان [1]پشتو زبان کی ادبی تاریخ کا آغاز روشنائیہ تھی لیکن اپنے [2]کے کے نام سے ایک کتاب مقفٰی نثر میں لکھی۔ ان کی اپنی مادری زبان اُرمڑی متصوفانہ خیالات کو عوام تک پہنچانے کے لیے خیر البیان کو الہامی انداز میں پشتو زبان میں لکھا۔ بایزید کے بعد ان کے مریدوں اور شاگردوں ارزانی اور دولت وغیرہ نے پشتو زبان کو شاعری سے آشنا کیا۔ اس شاعری کا رنگ متصوفانہ ہے اور زبان فارسی افکار و تصورات سے بھری پڑی ہے۔ اور ان کے شاگرد آخوند درویزہ [3] روشنائی تحریک کی شدید مزاحمت سید علی ترمذی العروف پیر بابا کی طرف سے ہوئی۔ سید علی ترمذی کی کتاب مکتوبات تو فارسی میں تھی لیکن آخوند درویزہ نے اپنی تصنیف مخزن کو پشتو میں لکھا۔ ان دونوں کی اولاد نے شاعری میں بھی طبع آزمائی کی اور یہ سلسلہ کئی دھائیوں تک چلا۔ اس سلسلے کے سب سے اہم شاعر سید حسین تھے جو رحمان بابا کے ہمعصر تھے۔ خوشحال خان خٹک کہتا ہے کہ مجھ سے پہلے پشتو میں تصنیف و تالیف اور شاعری کا رواج نہیں تھا، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان سے بہت پہلے روشنائیوں نے نہ صرف پشتو نثر لکھی بلکہ شاعری بھی کی۔

سے نکلی ہے۔ اوستا میں عربی کی طرح شعری بحور و اوزان نہیں [4]پشتو قدیم ایرانی زبان اوستا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عربی کے بحور و اوزان کے پشتو میں استعمال کا تجربہ کامیاب نہ ہوسکا۔ اس کے کنڑ کے رہنے والے تھے اور [5]قسم کا اولین تجربہ شرف الدین نے کیا جو بقول عبد الحئی حبیبی مغلوں کے آخری دور میں دہلی میں رہے۔ شرف الدین کا پشتو شعراء پر زیادہ اثر نہیں ہوا اور عربی عروضی قواعد پشتو میں رواج نہ پا سکے۔

موجودہ دور میں سمندر خان سمندر نے اپنی کتاب "قافیہ" میں یہ کوشش کی کہ پشتو شاعری کو عربی فارسی کے عروضی قواعد کے دائرے میں لائے۔ تاہم ان کی کوششوں کو بھی قبول عام حاصل نہ ہوا۔ ان کوششوں کی ناکامی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ پشتو زبان کا مزاج ان قواعد کا متحمل ہی نہیں ہوسکتا۔اس جہ سے پشتو میں شاعری کا اپنا ایک سادہ اور آسان قاعدہ وجود میں آیا جسے "سیلاب" کہا جاتا ہے۔ سیلاب لفظ کے متحرک حصوں کو کہتے ہیں اور اور ان حصوں کی تعداد شعر کا پیمانہ ہے۔ مثلا رحمان بابا کے اس شعر کے ہر مصرعے میں بارہ بارہ سیلاب ہیں:

ما سحر صبا لیدلے وو د چا مخ

چی می درستہ ورز ونہ لیدلو دا ستا مخ

ترجمہ: میں نے صبح صبح کس کا منہ دیکھا تھا کہ تمام دن تیرے دید سے محروم رہا۔

یہاں "ما" ایک سیلاب ہے جبکہ "سحر" دو سیلاب پر مشتمل ہے یعنی "سَ" اور "حر"۔

ما	سَ	حر	سَ	با	لی	دِ	لے	وو	د	چا	مخ	
چی	می	درس	تہ	ورز	و	نہ	لی	دو	دا	ستا	مخ	

اسی طرح پشتو صنف ٹپہ (لنڈئی) کا پہلا مصرع نو سیلاب کا ہوتا ہے اور دوسرا تیرہ سیلاب کا۔ مثلاً:

ځان ئی زړوجامو کښی جوړ کړو

لکہ پہ وران کلي کښی باغ د ګلو وینہ

ترجمہ: محبوبہ نے پھٹے پرانے کپڑوں میں خود کو یوں سنوار لیا ہے جیسے کسی اجڑے گاؤں میں پھولوں کا باغ ہو۔

ځان	ئی	زړ	وُ	جا	مو	کښی	جوړ	کړو						
لَ	کہ	پہ	وران	کَ	لی	کښی	دَ	باغ	گُ	لو	وی	نہ		

پشتو کی ایک مشہور صنف چار بیتہ سے ایک مثال ملاحظہ کیجئے . شاعر ہیں بابائے چاربیتہ عبد الواحد ٹھیکہ دار:

پلتنے راغلے پہ قصور باندے

د ډاکہ مارو پہ دستور باندے

چودھری صلاح کوی د خور سره

ابه به حبثمه د لاهور سره

ترجمہ:جب فوجیں ڈاکووں کی طرح قصور تک آگئیں اور (جنرل) چودھری اپنی بہن سے کہتا ہے کہ (آج میں لاہور کا پانی پیوں گا۔ (1965 کی جنگ کا تذکرہ ہے

اس کے ہر مصرعے میں دس سیلاب ہیں۔

اس طرح مصرعوں کی تقسیم اور ان کے ایک دوسرے کے ساتھ مقابلے کو آسان بنایا گیا۔ چونکہ پشتو زبان کی صوتیات، اس لہجہ اور مزاج، سب کچھ دوسری زبانوں سے بہت مختلف ہے، اس لیے عربی فارسی کے عروضی قوانین کی یہاں پابندی بہت مشکل ہے، جب کہ "سیلاب" کا طریقہ بہت آسان اور سادہ ہے جسے ہر کوئی معمولی کوشش سے سیکھ سکتا ہے۔

Q.NO.02

افغانوں کی روایات کے مطابق بھی امیر قیس کا نام عبدالرشید خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رکھا اور فرمایا کہ ان کی نسل اسلام پر اس قدر مضبوطی سے کاربند ہوگی کہ جس طرح کشتی کا بطان ہوتا ہے اور پھر یہی لقب بعد میں زبان کے تغیرات کے باعث پٹھان بن گیا

جبکہ لفظ پختون کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ بخت نصر کے ظلم سے بھاگ کر فارس (ایران) میں پناہ لینے والے قبائل میں سے ایک قبیلے کا نام بنی پخت تھا جس سے تعلق رکھنے والوں کو رفتہ رفتہ پختون کہا جانے لگا۔ اہلِ ایران انہیں افغان کہتے ہیں جس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ جب بخت نصر نے ان لوگوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا تو یہ لوگ اس ظلم کے خلاف آہ فغاں کرتے رہے۔ اور ایک بات یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ کہ افغان سلیمان علیہ السلام کے ایک بیٹے کا نام تھا اور ان کو جنات کی زبان سے پیار ہوگیا تھا تو انہوں نے اپنے والدحضرت سلیمان علیہ السلام سے کہا کہ آپ جنات کو کہیں کہ مجھے اپنی زبان سیکھائیں حضرت سلیمان علیہ اسلام نے اپنے بیٹے کی درخواست قبول کی اور جنات کو حکم دیا کہ آفغان کو جنات کی زبان سیکھائی جائے وہ زبان بعد میں "پختنو" کے نام سے مشہور ہوگئی۔

بعض مورخین کے مطابق پٹھان آریائی یا یونانی نسل سے ہیں۔اور بعض کے نزدیک یہ قیس عبدالرشید کی اولاد ہیں جبکہ تیسرے نظریئے کے مطابق ان کا تعلق بنی اسرائیل کے گمشدہ قبائل سے ہے۔

خود کو قیس عبدالرشید کی اولاد سمجھنے والونکا نظریہ ہے کہ مکہ میں قیام کے دوران حضرت خالد بن ولیدؓ نے اپنی صاحبزادی اُن کے مورثِ اعلیٰ کے نکاح میں دیدی تھی جنہیں وہ ہمراہ لے کر اپنے وطن واپس آیا اور پھر انہوں نے یہاں اپنی بقیہ زندگی اسلام کی ترویج و اشاعت میں صرف کر دی۔

اس طرح قیس عبدالرشید کی اولاد پٹھان کہلاتی ہے جبکہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خود قیس عبدالرشید کا تعلق بھی بنی اسرائیل کے بادشاہ ساؤل (حضرت طالوت) کی سینتیسویں پشت سے تھا۔ اس طرح آخری دونوں نظریات کی روشنی میں ان کا تعلق بنی اسرائیل سے ہی بنتا ہے۔

اورمیرے دلچسپ معلومات پیج کے دوستوں سب سے بڑی عجوبہ خیز بات یہ ہے کہ ان میں یوسف زئی (یوسف کے بیٹے)، داؤد خیل (داؤد کے بیٹے)،موسیٰ خیل (موسیٰ کے بیٹے) اور سلیمان خیل (سلیمان کے بیٹے) سمجھے جاتے ہیں لیکن اس کی تصدیق کرنا بہت مشکل ہے کہ موسیٰ خیل، داؤد خیل، یوسف زئی، سلیمان خیل وغیرہ کا قدیم پس منظر کیا ہے۔

بہرحا ل ہندوستان والے انہیں پٹھان کہتے ہیں۔ جبکہ پاکستانی انہیں پٹھان اور پشتون، ایرانی افغان کہتے ہیں مگر یہ خود کو پختون کہتے ہیں۔ یہ لوگ اس وقت متعدد قبائل کا مجموعہ بن چکے ہیں جبکہ ان قبائل کی ہزارہا شاخوں کی متعدد ذیلی شاخیں بھی ہیں جو اشخاص یا علاقے سے منسوب کی گئی ہیں۔

اہل ایران انہیں افغان کہتے ہیں وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ جب بخت نصر نے ان لوگوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا تو یہ لوگ اس ظلم کے خلاف آہ فغاں کرتے تھے۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ شاہ دول کے پوتے کا نام افغان تھا یہی افغانوں کا مورث اعلیٰ ہے۔

/ ہندوستان والے انہیں پٹھان کہتے ہیں

جبکہ تمام کے تمام پٹھان خود کو پشتون یا پختون کہتے ہیں۔ خوست، وادی کرم اور باجوڑ والے بھی خود کو پشتون کہتے ہیں۔ یہ سب الفاظ ایک ہی لفظ کی مختلف شکلیں ہیں۔ یعنی افغان، اوغان ، پشتان، پٹھان۔ خراسان میں ایک شہر پاشت ہے پشتان نیشار پور میں ایک مقام کا نام ہے

افغان متعدد قبائل کا مجموعہ ہے جن کاجد امجد اعلیٰ ایک ہے۔ مثلا ابدالی، غوری، یوسفزی،ہنی ، منگل، کاکڑ، وزیری، محسود، بنویان، آفریدی،تنولی, خٹک ، بنگش، مہمند، غورغشت، نیازی وغیرہ۔ پھر ان قبائل کی ہزار ہا شاخیں ہیں پھر ان شاخوں کی ذیلی متعدد شاخیں۔ جو اشخاص یا علاقے سے منسوب کی گئی ہیں۔ مقام کے بارے میں ارباب تاریخ مختلف آرا پیش کرتے ہیں کہ وہ بحیرہ خضر کے باشندے ہیں جو سواحل کیسپین میں آباد تھے اور بلاد ایران میں غارت گری کیا کرتے تھے پھر بلاد خراسان میں آباد ہوئے بعض دریائے اٹک سے خراسان تک کے کوہستانی علاقے میں آباد لوگوں کو

افغان کہتے ہیں۔

بعض انہیں قطبیوں کی اولاد بتاتے ہیں جو بعد میں ہندوستان آئے تھے۔

بعض انہیں بنی اسرائیل سمجھتے ہیں کہ بخت نصر نے ان کی اولاداور خود انہیں قتل کر ڈالا اور بقایا جان بچا کر ان پہاڑوں میں جابسے۔ جسے کوہستان غور کہتے ہیں ان لوگوں نے اپنے قدیم نام مسکن وادی غور میں واقع شام کے نام پر اس جدید مسکن کا نام بھی غور رکھا اور زبان کو بخت نصر کی طرف نسبت کرکے پختو کہا جو بعد میں پشتو ہوگیا۔ ان لوگوں کی تعداد بڑھتی گئی ۔

عرب کے یہودیوں کے ساتھ مراسلات کا سلسلہ جاری رہا۔ جب عرب یہودی مشرف با اسلام ہوئے تو انہوں نےخالد نامی شخص کو دعوت اسلام کے لیے ان افغانوں کے پاس بھیجا۔ اور بعد میں افغانوں نے اپنے سرداروں کی ایک جماعت کو عربستان بھیجا۔ ان میں ایک شخص کا نام قیس تھا۔ جس کا نسب نامہ 47 واسطوں سے اولاد بنی اسرائیل سے اور 55 واسطوں سے حضرت ابراہیم سے ملتا تھا۔ خالد نے اس جماعت کو حضور کے پاس حاضر کیا حضور نے قیس کا نام ملک عبدالرشید رکھا افغانوں کی یہ جماعت فتح مکہ میں بھی شریک رہی تھی قیس کی وفات 47ھ میں ہوئی عمر 87 تھی۔

پشتو زبان اور تاریخ

جتنی پرانی تاریخ پشتونون کی ہے اتنی ہی پرانی تاریخ پشتو زبان کی ہیں۔ اس لیے پشتو نہ صرف پشتو زبان بلکہ اسکی اچھی ثقافتی اقدار کی ہیں۔ جس میں پشتونوں کو پہچانا و سمجھا جاسکتا ہیں۔ اگر ہم یہ کہے کی پشتو کی وجہ سے پشتون پشتون ہے تو غلط نہ ہوگا۔ اس لحاظ سے جتنی پشتو پرانی زبان ہے اتنی ہی پرانی تاریخ پشتونوں کی ہے۔ پشتو یا پختو ایک مشرقی ایرانی زبان ہے جو پٹھانی یا افعانی بھی کہلاتی ہے۔ یہ افغانستان اور پاکستان میں بولی اور پڑھی جاتی ہیں۔ یہ افغانستان کی سرکاری اور قومی زبان بھی ہے۔ اسی وجہ سے اسے بین الاقوامی حیثیت حاصل ہے۔

۔ قاضی عبدالحلیم نے پشتو اکیڈمی پشاور کے ایک رسالہ "پشتو" میں یہ ثابت کیا ہے۔ کہ پشتوں سات ہزار سال پرانی زبان ہے۔ ۲۔ رگ وید میں پشتوکا ذکرکیا گیا ہے۔ یہ کتاب (1400)ق م میں لکھ گیا ہے۔ اس لحاظ سے تقریبا (3380) سال پرانی ہے۔

۳۔ ھیروڈوٹس یونانی مورخ نے سال (484-425) ق م میں پشتون وطن پکتیکا کا زکر کیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ زبان تقریبا (2400) سال پرانی ہے۔ اور اسی جسے کہی تاریخی لوگوں نے اپنے کتابوں میں پشتو زبان کی تاریخ کا ذکر کیا ہے۔ جن میں البحرسکائی،بطلیموس بھی شامل ہے۔

۴۔ پشتوں زبان کی محقق محترم جناب قاضی اثر مرحوم اپنے کتان پشتو ادب میں لکھتا ہے۔ کہ جاپان کے شہنشاہ میکاڈو اپنے کتب خانے میں محاتما بدھ کہ مذھب کا ایک کتاب ہے۔ رسم الخط پالی یعنی

خروشتی ہے اور زبان پشتو ہے۔ غالبا بلخ کے اس پاس لکھی گئی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پشتو رسم الخط اسلام سے پہلے پالی زبان یعنی خروشی زبان میں لکھی جاتی تھی۔ اس لحاظ سے پشتو ادب کی تاریخ (2500) سال پرانی ہے۔

۵۔ ایران کی بادشاہ "داریوش" جس نے (522 سے 486 ق م) تک حکوت کی ہے۔ اس نے پشتو زبان کی تین مصرعے لکھے ہیں جو میخی روسم الخط میں لکھی گئی ہے۔ اس لحاظ سے پشتو ادب (7500) سال پرانی ہے۔

۶۔ محمد ھوتک "پٹی خزانہ" پشتو کتاب سے ثابت ہے کہ پشتو تیسری صدئ ھجرئ میں لکھا گیا ہے۔ اس لحاظ سے ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ پشتو ادب کتنی پرانی ہے۔

Q.NO.03

پنجابی ہندوستانی اور ایرانی زبان کا امتزاج ہے۔ اس کو ہندوستانی زبانوں میں کافی موثر حیثیت حاصل ہے۔ پنجابی قوم کئی مختلف نسلوں کے اختلاط سے معرض وجود آئی ہے جو کہ پنجابی علاقوں پر حملہ آور ہونے کے ساتھ مہاجرت کے ذریعہ آباد ہوتے رہے،جن کا زیادہ تر تعلق شمالی پہاڑی علاقوں اور ممالک سے تھا اور جن کی منتقلی کی وجوہ ان علاقوں میں روز گار کے کم مواقع، سخت موسمی حالت، زرعی اجناس کی کمی اور پنجاب کی سر سبز زمین، لہلہاتے کھیت ،پانی کی فراوانی اور دوسرے لوگوں کو اپنے علاقوں میں بسنے اور جذب کرنے کی مقامی آبادی کی صلاحیت تھی۔ انہوں نے کبھی حملہ آوروں کے خلاف مزاحمت نہیں کی تھی۔

موجودہ تاریخی تناظر میں قیام پاکستان کے بعد بھی پنجابیوں کی جدوجہد کبھی حکمران طبقات کے خلاف نہیں رہی ہے۔ یہاں کی اشرافیہ، جاگیرداراور سرمایہ دار طبقات نے ہمیشہ اسٹیبلشمنٹ کا ساتھ دیا ہے۔ پنجابی زبان کے فروغ کے دعوئ داروں نے علامتی طور پر احتجاج اور مطالبات کئے ہیں۔ اس حوالہ سے منعقدہ پنجابی عالمی کانفرنسیں محض میڈیا کی زینت بن سکی ہیں مگر عام پنجابی بولنے والوں میں کوئی تحریک پیدا کرنے میں ناکام رہی ہیں۔اس طرح پنجابی زبان بالعموم پنجابیوں کی شناخت کا ذریعہ نہیں بن سکی ہے۔ پاکستان میں جاری پنجابی زبان کی ترویج کی تحریکوں کے اسلاف سیاسی، ذاتی یا ادبی حوالوں سے ہیں۔ ان کی عام آدمی کے مسائل کے حوالہ سے کوئی تعلق داری پیدا نہیں کی جاسکتی ہے۔

کچھ گروہ اس کو ادبی اور لسانیت کے حوالہ سے فروغ دینا چاہتے ہیں، کچھ اس کو سیاسی قوت کے طور پر استعمال کرنے کے خواہشمند ہیں اور کچھ علاقائی زبان کے مختلف لہجوں کے حوالہ سے

تقسیم کر تے ہیں جس میں پوٹھوہاری، وسطی پنجاب اور سرائیکی بیلٹ شامل ہیں۔ اس وقت پنجابی بولنے والوں کی تعداد پاکستانی پنجابی علاقوں میں آٹھ کروڑ ہے جو کہ پاکستان کی کل آبادی کا 55فیصد ہیں۔ 30ملین ہندوستان میں بستے ہیں جن کی زیادہ تعداد مشرقی پنجاب میں آباد ہے۔ اس کے علاوہ ہریانہ اور دہلی میں بھی کافی تعداد میں پنجابی بستے ہیں۔ یہ ہندوستان کی کل آبادی کے لگ بھگ 3فیصد ہیں۔ 10ملین کے قریب پنجابی جن میں زیادہ تعداد سکھوں کی ہے، ہندوستان سے باہر برطانیہ، شمالی امریکہ، مشرق بعید (ملائیشیا میں 2لاکھ سکھ آباد ہیں) اور مڈل ایسٹ وغیرہ شامل ہیں۔ ان پنجابیوں میں 54فیصد مسلمان، 29فیصد ہندو، 14فیصد سکھ اور 3فیصد عیسائی شامل ہیں مگر سیاسی اور معاشی قوت کے حوالہ سے صورتحال بالکل ڈرامائی ہے۔ پاکستان سیاسی، فوجی اور معاشی قوت کے حوالہ سے ایک پنجابی ریاست ہے جس کو پارلیمنٹ، فوج اور دیگر سول اداروں، تجارت اور صنعت مینبالادستی حاصل ہے ۔ پنجابی جاگیردار سیاست اور ریاست میں اہم کردار ادا کرتے ہیں مگر پنجابیت کے حوالہ سے ان کی سرگرمیاں بالکل متصادم ہیں اور یہ حکمران طبقہ کے زبان و اظہارکے غلام ہیں۔ ہندوستان میں بسنے والے پنجابی اس ملک کے زرخیز ترین زرعی خطے کے باسی ہیں جو کہ ہندوستان کی ایک ارب سے زیادہ آبادی کو غذائی اجناس اور غلہ فراہم کرتا ہے۔ ہندوستانی فوج کے اعلیٰ افسران کی کافی زیادہ تعداد پنجابیوں پر مشتمل ہے۔جواہر لال نہرو کی والدہ کا تعلق لاہور سے تھا۔ پروفیسر عبدالسلام کا تعلق بھی بھارتی اور پاکستانی پنجاب سے ہے۔ اردو کے ممتاز شاعر فیض احمد فیض اور ساحرلدھیانوی کا تعلق بھی پنجاب سے ہے۔ اسی طرح جدید شاعری اور ادب کی ترویج کے حوالہ سے سب سے زیادہ کام پنجابی زبان میں ہورہا ہے۔

دنیا میں 55کے قریب پنجابی چینل قائم ہیں۔ لاتعداد ایف ایم ریڈیو پنجابی زبان میں نشریات پیش کر رہے ہیں۔ گلیوں، بازاروں اور عام آدمی کی زبان پنجابی ہے۔ ان اعدادو شمار کی موجودگی میں پنجابی زبان کی تیزی سے پائمالی کے بارے میں کیسے سوچا جا سکتا ہے؟ پاکستان میں پنجابی زبان کے ٹی وی چینلز کو سب سے زیادہ پذیرائی حاصل ہے۔ سب سے زیادہ شاعرانہ کلام پنجابی زبان میں مقبول عام ہے مگر اتنے موثر اظہارفصاحت و بلاغت کے باوجود تاریخی طور پر پنجابی ریاستی زبان کا درجہ اختیار انہیں کرسکی ہے جس کی ذمہ داری پڑھے لکھے پنجابیوں اور بیورو کریسی پر ڈالی جا سکتی ہے جنہوں نے اپنے لسانی حقوق کی خاطر جدوجہد کے بجائے مہاجر بیوروکریسی کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجابی سرکاری کے بجائے ہمیشہ عام آدمی کی زبان رہی ہے۔ یہ ہمارے الیکٹرانک میڈیا کا کمال ہے کہ اس نے اب اس کو ہمارے بالائی حکمران طبقات کے خاندانوں کے کلچر میں داخل کر دیا ہے۔ کچھ ڈراموں میں اردو زبان میں پنجابی زبان کے امتزاج نے

اس کو حکمران طبقات میں قبولیت کی سند بخشی ہے۔ ممتاز دانشور پروفیسر شریف کنجاہی صاحب نے کہا تھا "استاد امام دین کی شاعری اور لہجہ ہماری مستقبل کی اردو اور پنجابی زبان سے ہم آہنگ ہوگا

سولہویں اور انیسویں صدی کے دوران پنجابی زبان و ثقافت کا فروغ سکھ گوروں، مسلمان صوفی شعرائ، ہندو بھگتوں کے ذریعہ ہوا جنہوں نے تخت و تاج اور ریاست کاروں کی مخالفت کی اور مضبوط نظریاتی پنجابیت کا درس دیا۔ اس عمل میں بابا بلھے شاہ اور شاہ حسین نمایاں رہے ہیں۔ انہوں نے علامتی اظہار کے ذریعہ شاہی روایات اور اقتدار کے خلاف تحریروں میں عوامی جذبات کا اظہار کیا تھا۔ ہندوستان کے پنجابی حکمران رنجیت سنگھ نے پنجابی ریاست قائم کی (1799-1839ئ) مگر سرکاری زبان فارسی رکھی۔ 1849ءمیں پنجاب میں انگریزوں کے عمل دخل کے بعد انہوں نے دیگر برطانوی نو آبادیاتی علاقوں میں رائج اردو زبان کو پنجاب میں سرکاری زبان قرار دیا جس سے شہری علاقوں مینیہ تاثر ابھارا گیا کہ پنجابی زبان اردو اور ہندوستان سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ یہ بات تقریباً درست تھی۔ پنجابی زبان کو کبھی ریاستی سرکاری زبان کا درجہ حاصل نہیں ہوا ہے۔ پنجابی زبان کی پہلی لغت انیسویں صدی کے وسط میں لدھیانہ کے عیسائی مشنریوں نے شائع کی۔ بیسویں صدی کے نصف تک پنجابی شناخت نسلی تضادات کی وجہ سے متاثر ہوئی۔

پنجابی شاعری اور زبان کو زندہ رکھنے والوں میں میلوں ٹھیلوں، تھیٹرز کمپنیوں اور لوک فنکاروں کا خاص کردار ہے ۔ بہرصورت معروضی صورتحال میں گلوبلائزیشن کے نئے کلچر، زبان و کردار کے باوجود پنجابی زبان میں زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہے۔ خصوصاً وہ زبانیں جو کہ مقامی ثقافت اور کسی مذہب کے ساتھ جڑت رکھتی ہیں وہ ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔ پاکستان میں پنجابی زبان کے ساتھ سوتیلا سلوک روا رکھنے کے باوجود یہ ابھی تک پنجاب میں اکثریتی آبادی کی زبان ہے۔ یہ واحد زبان ہے جس کو دوسری زبانیں بولنے والے آسانی سے سمجھ اور بول لیتے ہیں۔

Q.NO.04

پنجابی کی جدید کہانیوں کامجموعہ "سانجھی کندھ"کا تجزیہ کیا ہے۔غلام مصطفی نے اپنی کہانیوں میں پنجاب کی رہتل کی سچی عکاسی کی ہے۔ ان کی تحریر میں پنجابی معاشرے کے کلچر کی بہت عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے۔مصنف نے اچھے انداز میں ہمارے دیہاتی زندگی کے مختلف موضوعات کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔

کہانی کو شارٹ سٹوری ، افسانہ جیسے نام ادب میں دیئے گئے ہیں۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ بیتی

ہوئی باتوں یا حالات کو سنتا سناتا آیا ہے جب اسے لکھنے کا شعور آیا تو اس نے انہیں لکھنا شروع کر دیا اور ہمیں بہت سی باتیں سوانحی حالات میں لکھی ہوئی ملتی ہیں۔ لیکن جیسے جیسے ترقی ہوتی گئی اسے با قاعدہ صنف کا نام دے دیا گیا ۔ پنجابی زبان میں اس کے آغاز سے قبل اس کی معنی اور تعریف سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ارشاد احمد اپنی لغت میں لکھتے ہیں۔ "کہانی ہڈ بیتی، ہوتی، بیتی، قصہ ،جگ بیتی" (۱) پنجابی اردو لغت میں کہانی کے معنی کچھ یوں بیان ہوتے ہیں۔ "کہانی، سرگزشت، قصہ، افسانہ، داستان، آپ بیتی، جگ بیتی، بحث مباحثہ، جھگڑا، نسبت، بگاتی، منگنی۔" (۲)

فیروز اللغات میں کہانی کے بارے میں درج ہےکہ: کہانی، حکایت، قصہ، داستان، افسانہ و ذکر، بیان، سر گزشت، گزری ہوئی بات۔(۳) بیان کی گئی تعریفوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کہانی، جگ بیتی، افسانہ،قصہ یا داستان وغیرہ کو کہا جاتا ہے پنجاب میں یہ ریت بہت پرانی چلی آرہی ہے کہ جب بچہ سونے لگتا ہے تو اس کی ماں، دادی، نانی یا خالہ وغیرہ پریوں، جنوں یا دیوی دیوتا کی کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ اس وقت کہانی صرف اور صرف تخیلات پر مبنی تھی اس کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ کہانی انسان کی زندگی میں اعلیٰ اقدار کی حامل ہے۔ دنیا کے تمام ممالک جہاں علم و فن کو پڑھا اور سمجھا جاتا ہے ان میں کہانی کا رواج بہت قدیم ہے۔ عبدالحمید سرشار کہانی کے بارے میں یوں رقم طراز ہوتے ہیں:

"یونان وچ دیویاں تے دیوتیاں دے دور توں پہلے دیاں کہانیاں موجود نیں۔" (۴)

برصغیر پاک و ہند میں شارٹ سٹوری یا افسانہ انگریز نے متعارف کرایا اور یہ بات بھی مانی جاتی ہے سب سے پہلے یہاں عیسائی مشنریوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے پنجابی زبان میں کچھ قصے کہانیاں لکھے۔ اسی دوران گور مکھی ٹائپ رائٹر کی ایجاد ہوئی جس کے بعد سکھ پنجابی کہانی کار سامنے آئے۔ کتاب " سانجھی پیڑ" کے دیباچے میں لکھا ہے:

"انگریزاں دے آون نال ایتھے دے پڑھے لکھے لوکاں نے اوہناں دا ادب پڑھن دی شعوری کوشش کیتی تے اودوں ای نکی کہانی نوں اپنایا گیا"(۵)

ویسے دیکھا جائے تو پنجاب میں لوک ادب موجود رہا ہے اور اب تک اس کے اثرات موجود ہیں۔ چڑیا، طوطا ،مینا، گائے، خرگوش وغیرہ کی کہانیاں بچوں کو سنائی جاتی رہی ہیں۔ لیکن یہ ادب ترقی کرتا کرتا خود بخود کہانی تک نہ آسکا۔ اس پر مغرب کی چھاپ لگنے کے بعد ہی ترقی آئی۔ڈاکٹر شہباز ملک پنجابی کہانی کی تاریخ کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"پنجابی ول ویکھے تے سانوں ایس دی روپ ریکھا پہلاں پہل لکھی جدید حوالے یا نثر دی کتاب

پنجابی بات چیت ۱۸۷۵ء وچ لبھدی اے۔" (۶)

پنجابی زبان میں کہانی لکھنے کا رواج پڑا تو پہلے کہانی کاروں میں لال سنگھ کملا اکالی، گور و بخش کے نام آتے ہیں لیکن پہلا باقاعدہ کہانی کار بھائی ویر سنگھ کو مانا جاتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر شہباز ملک لکھتے ہیں:

" بھائی ویر سنگھ نے وی پنجابی لکھی تے بعض لوک اوہناں نوں ای پہلا کہانی کار مندے نیں۔"(۷)

۱۹۲۳.۲۴ء میں ہرسدھ پنجابی رسالے "پریتم" اور "پھلواڑی" جاری ہوئے ان میں اس زمانے کی اچھی کہانیاں شائع ہوئیں ڈاکٹر انعام الحق جاوید لکھتے ہیں:

"ہیرا سنگھ درد کا کسان کی آہیں۔ بلونت سنگھ چترتھ کا شپ دی پٹاری، گیانی کبیر سنگھ کنول کا پریت دیا تانگھا، مہر سنگھ کا چنن ہار، موہن سنگھ جوش کا آزادی دے پروانے رام سنگھ کا ست ونڈی، اور کے ایس پنچھی کا پھلواڑیاں مارکیٹ میں آئے۔" (۸)

اس کے علاوہ چرن سنگھ سہیچ، گوربخش سنگھ، نانک سنگھ کے نام مشہور ہیں۔ سکھوں کے علاوہ جو پنجابی زبان کے شاہ مکھی رسم الخط میں سب سے پہلا نام آتا ہے وہ فیصل آباد کے جوشو افضل دین کا ہے انہوں نے ۱۹۲۸ء میں رسالہ "دربار" جاری کیا۔ اس رسالے میں کپور سنگھ، ہرکشن لال، اور اظہر حیدر بھی شاہ مکھی یا فارسی رسم الخط میں لکھنے والے شامل ہوئے پھر یہ کام اور آگے بڑھا تو فضل شاہ، رشید احمد گجراتی، میراں بخش منہاس، تاج دین تاج، محمد رفیع، ریاض انور خورشید عالم اور بہت سے نام ملتے ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد کہانی لکھنے کا کام رک سا گیا کیوں کہ زیادہ تر لکھاری بھارت چلے گئے۔

روزنامہ "آغاز" لاہور نے ۱۹۴۸ء میں ایک پنجابی ایڈیشن جاری کیا جس میں سجاد حیدر کی کہانی چھپی۔۱۹۵۱ء میں ڈاکٹر فقیر محمد فقیر نے رسالہ "پنجابی" کے نام سے جاری کیا جس میں کہانی لکھنے والوں کا سمندر اُمڈ آیا۔ جن میں عبدالمجید سالک، صوفی تبسم، مجید لہوری، اکبر لاہوری، جوشو افضل الدین، چودھری محمد اکبر خاں، صادق قریشی، سہیل یزدانی، نور کاشمیری وغیرہ کے نام سامنے آئے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد پنجابی کہانی کا عروج شروع ہوا اور بہت سارے اردو لکھنے والوں نے بھی ماں بولی کو ترجیح دی۔

افضل احسن رندھاوا، نواز، احمد ندیم قاسمی، نواز، شریف کنجاہی، اکمل علیمی، رشیدہ سلیم سمیں، نجیب اسلم، شگفتہ پروین، آصف رانا،محمد آصف خاں وغیرہ کے نام شفقت تنویر مرزا اور راجا رسالو ترجمہ کاروں کے روپ میں سامنے آئے۔پھر یہ دور چلتا رہا اور ان میں چودھری حنیف باوا، ناصر بلوچ، پروین ملک، غلام مصطفی بسمل، اقتدار واجد، محمد سلیم بھٹی، احمد شہباز خاور، جمیل

احمد پال، کہکشاں کنول، عاشق رحیل، اقبال قیصر، خالد فرحاد، دھاری وال، دلشادٹوانہ، اقبال صلاح الدین، غلام حسین ساجد ، ملک مہر علی، علی اختروغیرہ اور اب باقاعدہ طور پر غلام مصطفی اپنی کتاب "سانجھی کندھ" کے ساتھ شامل ہو چکا ہے۔

کسی بھی زبان کے ساتھ محبت کا ثبوت یہی ہوتا ہے کہ اس میں ادب تخلیق کیا جائے اور اس کا پرچار کیا جائے یہاں ہماری مراد پنجابی زبان سے ہے۔ پنجاب کی اس زبان کو اچھا لکھنے والوں کی ہمیشہ ضرورت رہی ہے۔ دیکھنے میں آتا ہے کہ اردو زبان کے نامورلکھنے والے بھی اپنی ماں بولی کے ساتھ جُڑے رہے ہیں اور اس کے ادب میں اپنا کچھ نہ کچھ حصہ ڈالتے رہے ہیں ۔ ان بڑے ناموں میں سے اشفاق احمد مرحوم، منیر نیازی، شریف کنجاہی، انور مسعود، ڈاکٹر انعام الحق جاوید اور بہت سے نام لیے جا سکتے ہیں۔

غلام مصطفی نے ادب کی طرف اپنی طالب علمی کے دور میں ہی رجوع کیا اس نے پہلی کہانی ۲۰۱۲ء میں لکھی اس کے بعد وہ کچھ نہ کچھ پنجابی زبان میں لکھ کر مختلف رسائل میں شائع کرواتا رہا یہی نہیں اس نے اس شوق کو فرض کی طرح سمجھا اور اپنی شائع شدہ اور نئی کہانیوں کو یکجا کر کے ایک مجموعہ کی شکل میں سنگری پبلشرز، فیصل آباد سے ۲۰۱۷ء میں ہی شائع کروایا۔ اس پنجابی کہانیوں کے مجموعے کا نام "سانجھی کندھ" ہے اس کا دیباچہ "احمد شہباز خاور" اور فلیپ علی اختر نے لکھا ہے۔ یہ دونوں بھی فیصل آباد میں پنجابی زبان و ادب کا قیمتی سرمایا ہیں۔ شاعر، ادیب، کہانی کار اور ناول نگار ہیں۔ ان دونوں کی رائے سے یہ کتاب اور بھی کامیاب نظر آتی ہے۔

اس کتاب کی ساری کہانیاں اُن تصاویر کی مانند ہیں جن کو دیکھتے ہی پنجاب، یہاں کا معاشرہ، رہن سہن اور روز مرہ کے واقعات سامنے آجاتے ہیں یا یوں کہیے کہ اس کو پڑھ کر یوں لگتا ہےکہ جیتے جاگتے پنجاب کی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

کہانی "ویہڑا" کو پڑھ کر لگتا ہے کہ اگر انسان چاہے تو بہت سارے ایسے رشتے جن کے ٹوٹنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ انہیں بھی اپنی عقل و دانش کو استعمال میں لا کر سیدھی راہ پر لا سکتا ہے:

"بالاں دی سانبھ سنبھال تاں اک ماں ای کر سکدی سی۔ اوہنوں اوہدے لگدیاں تے ذیشان ورگے یاراں بیلیاں وی آکھیا پئی اوہنوں بھل جاہن اوہ پرت کے نہیں آون لگی۔اوس اپنا آپ گوا لیا اے۔ پر ندیم اوہنوں بھلن لئی تیار نہیں سی۔ اڑدیاں اڑدیاں خبراں سن پئی اوہنے اوس منڈے نال ویاہ دا فیصلہ کر لیا اے۔" (۹)

ہمارے ملک کے نوجوان دبئی، سعودیہ اور بہت سے ایسے ممالک میں محنت مزدوری کی غرض

سے جاتے ہیں کچھ کے نصیب تو بدل جاتے ہیں مگر کچھ وہاں حادثات کا شکار ہو جاتے ہیں کہانی " مل دی موت" بھی کچھ ایسے ہی موضوع پر لکھی گئی ہے وہاں کیا ہوا آپ بھی دیکھیں:

"شہزاد نوں اوتھے دے قانون موجب سزا سنائی گئی، عربی سارا ضرم شہزاد تے پا کے خود نکل گیا، شہزاد دے ماں ، بہن تے پیو اج وی اوہدی اڈیک وچ نیں، پیو چاچے مشتاق ہٹی والے دے دن وچ کوئی دس پھیرے ماردا اے، تے پچھدا اے،میرے پتر دا فون آیا کہ نہیں" (۱۰)

کہانی "کھڈونا" تو پڑھ کر قاری کا دھیان فوراً موت کی طرف جاتا ہے کہ چاہے "سو ورھیاں وی جیونا، آخر ہو سی کھیہ۔"

"اج چاچا بالاں نال نہیں سگوں قدرت اوہدے نال کھیڈ رہی سی"۔ (۱۱)

کہانی "ست دیہاڑے"، دو نوجوان "عمران" اور "سہیل" کی ہے جس میں "سہیل" ایک پیر کی خلافت کے لیے اپنا آپ گنوا لیتا ہے۔ اس میں ہمارے سماج کی سچائی سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ آج کا نوجوان بغیر محنت کے شارٹ کٹ کے ذریعے سب کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے:

"اوہ حیاتی دے اوہ ست دیہاڑے بھل چکیا سی ، جیہڑے اوہنے بابا جی کول گزارے یاں، اوہناں ست دناں دی اک وی گل اوہنوں ہن یاد نہیں پئی اوس رات قبر اُتے کیہ ہویا سی۔ مردہ باہر آگیا سی یاں اوہنے بس ہتھ باہر کڈھے سن۔"(۱۲)

"دُلے دا گھوڑا" دلاور حسین عرف دلہ اور اس کے گھوڑے کی ہے جانور کے ساتھ پیار اور اس کا ایک دن مر جانا "دنیا فانی ہے" کا سبق سکھاتی ہے۔ پالتو جانوروں سے پیار اور ان کی وفاداری اسی کہانی کا موضوع دکھائی دیتی ہے:

"دلہ گھوڑے کول نمو جھانا بیٹھا رہندا تے کدی کدی غصے وچ آکے آکھدا " اوہ نمبر دارا تیرا ککھ نہ رہوے توں میرے گھوڑے نوں تویت پا دتے نیں تیرے گھر نوں اگ لگ جائے تیرے سارے ڈنگر سڑ جاون۔ توں میرے گھوڑے نوں تویت پا دتے نیں۔ " (۱۳)

"انٹر ویو" ایک ایسی کہانی ہے جس میں قسمت کا دروازہ کھلتا ہے تو تمام غم دوسرے دروازے سے باہر چلے جاتے ہیں اس کہانی میں نو جوان کی نیک نیتی اسے کامیابی تک لے جاتی ہے:

" باؤ نے فائل کھول کے دیکھی تے اوہدے بلیاں تے ہاسہ آگیا۔ اوہنے آکھیا، پتر توں سمجھ توں انٹر ویو وچوں پاس ہو گیا ایں۔ تیری نوکری پکی ہو گئی اے۔ مینوں وی ایسے بندے دی لوڑ سی جیہڑا اپنی غلطی خوشی نال من لوے۔" (۱۴)

کہانی " اللہ یاد تے بیڑا پار" میں ہمیں خدا کو ہر وقت یاد رکھنے کا درس ملتا ہے۔ انسان خدا کو بھلا کر کوئی بھی سکون حاصل نہیں کر سکتا کامیابی کا راز خدا کی یاد میں چھپا ہے:

"اپنی ساری گل اوہناں نوں دسی تے اوہناں رب سوہنے اگے دعا کیتی تے رانو نوں نماز، قرآن پڑھن دی تلقین کیتی ، رانو نے بزرگ دی گل پلے بن لئی ، سیانے آکھدے نیں " اللہ یاد تے بیڑا پار" گھر وچ سکون رہنا شروع ہو گیا۔" (۱۵)

"سانجھی کندھ" میں مکان میں کی ہوئی دیوار دلوں میں دیوار ثابت ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ یہ دیوار ہمیں گھروں کے ساتھ ساتھ بڑوں کو بھی بانٹنے پر مجبور کر دیتی ہے:

" بابے نوں اپنی گواچی بھوئیں تے دولت دوبارہ ملن تے رتی جناں وی چاء نہیں سی کیوں جے اوہ ایس ویلے محتاجی دی حیاتی گزار رہیا سی۔" (۱۶)

"چٹھی دی اڈیک" میں اپنا گاؤں چھوڑ کر شہر آئے اکبر کے حالات سے ایک بات یا دآتی ہے کہ بعض اوقات لوگ نصیب بدلنے کے لئے دھوکے کا شکار بن جاتے ہیں:

"دو ورھے لنگھ گئے کوئی چٹھی نہ اپڑی اکبر بیری نوں یاد کر دیاں روندا تے آکھدا اوہ کیہڑا ماڑا ویلا سی جد میں اپنے بھرا تے اپنے ماں پیو دی نشانی نوں چھڈیا، جیہدی چھانویں میں تے میرا نکا ویر کھیڈ کے جوان ہوئے ساں پر ہن ویلا لنگھ چکا سی۔" (۱۷)

"حیاتی دا پندھ" میں بتایا گیا ہے کہ زندگی چلتے رہنے کا نام ہے حادثہ چھوٹا ہو یا بڑا خدا کی رضا سمجھ کر آگے بڑھنا چاہیے:

" وسیم دیاں اکھاں وچ ہنجو سن، کیوں جے ایہو جہی ہونی اوہدے نال وی واہری سی تے ایہہ اوہی ٹرین سی جینے ہور وی کئی گھر اجاڑے سن۔" (۱۸)

"ہیر" آج کل کی کہانی ہے کہ نوجوان لڑکے لڑکیاں کیسے ایک دوسرے کے پیار میں پھنس جاتے ہیں اور پھر دھوکے کا شکار ہو جاتے ہیں جس سے پوری زندگی تباہ ہو جاتی ہے:

" جے کوئی ہونی واپری وی سی تاں گھر دا پتہ کیوں غلط دسیا سی ساڈے رانجھے اوس رانجھے وانگ ہمت تاں کیتی پر اگوں ہیر نوں کوئی کیدو ٹکر گیا سی؟ یا فیر اوہ ہیر ہے ای نہیں سی۔ " (۱۹)

کہانی " چلاکی" میں چوروں کے ذہین اور چالاک ہونے کا بتایا گیا ہے کہ کیسے آج کل ہمارے سامنے کھڑا انسان ہمیں لوٹ لیتا ہے اور ہم کچھ بھی نہیں کر پاتے:

"اوہ ٹرائی لین گیا تے مڑ کے نہ آیا تے ہن کرمو فراڈ دے کیس وچ حوالات وچ بند اے تے موٹر سائیکل دی ٹرائی لین جان والا پتہ نہیں کتھے کجھ ہور ٹرائی کر رہیا ہونا اے۔ " (۲۰)

"پردیس" ایک ایسی کہانی ہے جس میں بیرونِ ملک کی سنی سنائی جنت دیکھنے اور وہاں کی عیش و عشرت کمانے کی لالچ جیل میں لے جاتی ہے:

"دبئی اپڑے تاں تنویر مینوں اک تھاں بٹھا کے ۵منٹ داآکھ کے پرانہہ ٹر گیا، کافی چر لنگھ گیا اوہ نہ

پرتیا۔مینوں پلس والیاں آن گھیریا۔" (۲۱)

"چھاپ" میں بتایا گیا ہے کہ بعض اوقات ہم جس چیز کو بہت مہنگی سمجھتے ہیں اور سنبھال کے رکھتے ہیں اکثر وہ کوڑیوں بھاؤ بکتی ہے پر خدا مہربان ہو تو مشکلیں آسانی میں بدل جاتی ہیں:

" سنیارے نے چھاپ دا وزن کیتا اپنا حساب کتاب جیہا لایا چھاپ نوں ویکھ کے آکھیا" ایہہ ۱۲ ہزار دی ہو جائے گی۔" اہونے فوراً آکھیا " بس تسیں پیسے دے دیو" سنیارے نے ۱۰ ہزار گن کے دتا۔ اوہ جاون لگی تاں اوس آکھیا " بھین جی! تسیں ایہہ چھاپ وی لے جاؤ تے پیسے وی ایہدے اتے بس سونے دا پانی پھریا ہویا اے۔ اج تائیں کوئی وی غریب کسے وڈی لوڑ توں بنا سونا ویچن نہیں آیا۔" (۲۲)

"ابا جی " میں والدین کی قربانیوں کو خراجِ تحسین پیش کیا دکھائی دیتا ہے:

"مینوں فوراً لگا پئی اوہ مارکیٹ ای گئے ہونے نیں میں اوس پرچی تے لکھے پتے تے پہنچا تاں اوہ دکان دار نوں پہلی قسط تے موٹر سائیکل لیجاون دی التجا کردے پئے سن۔" (۲۳)

"دو پُتر کشمیر دے" میں اپنی مٹی سے محبت اور کشمیر کے موجودہ حالات کو موضوع بنایا گیا ہے۔دو پتر کشمیر دے میں کشمیری جوانوں کی کہانی بیان ہوئی جو اپنی دھرتی کے لیے شہید ہو جاتے ہیں:

"اگلی تھاں اپڑے تاں فوجیاں دی وڈی نفری موجود سی اوہناں سمجھیا پئی ساڈے ای ساتھی نیں۔ اوہناں کول جا کے اوہناں لا گے کھڑے ہو ئے ۷۰ دے لاگے بھارتی فوجی مارے۔ گولیاں کھا ندے گئے تے اوہناں نو واصل جہنم کردے گئے۔" (۲۴)

"چڑھیا سو تے لتھا بھو " میں ہمارے سماج کے موجود مسائل سے پردہ اٹھایا گیا ہے:

"اوہنے ہولی ہولی ساری دولت تے قبضہ کر لیا تے مڑکیس بنا کے جیل بجھوا دیتا۔ میں جیل کٹ کے واپس آون دی کیتی۔" (۲۵)

"نکی عید" میں بتایا گیا ہے کہ بعض اوقات ہماری چھوٹی سی سمجھ داری بھی کتنی سود مند ثابت ہو جاتی ہے:

"جیس تھاں تے ایہہ ڈگا اوتھے پہلاں توں ہوئے ایکسیڈینٹ پاروں کسے کار دی سکرین ٹٹی پئی سی، جیہدیاں کرچاں ایہدے جسے وچ کھب گئیاں سن۔" (۲۶)

کہانی" بارڈر" میں انڈیا اور پاکستان کا بارڈر پار کر کے آئی ہوئی ایک لڑکی کی کہانی بیان ہوئی ہے اور ان دونوں ممالک کے سفارتی تعلقات کو موضوع بتایا گیا ہے: " پاکستانی فوجی غیرت مند ہونے نیں اوہ کسے دی دھی بھین نوں اپنی سمجھن والے جنے نیں۔ اسیں ایہہ ساری گل پاکستانی سرکار

تائیں اپڑا دتی اے۔ ہن مسلے نوں اوہ ای نبیڑن گے۔" (۲۷)

کتاب کا اسلوب نہایت سادہ اورلفظوں کا انتخاب بھی بڑا معیاری ہے۔ دلچسپی کا عنصر نمایاں ہے پڑھتے وقت ذرا بھی بوریت کا احساس نہیں ہوتا ایسی تکنیک استعمال کی گئی ہے کہ کہانی ۵ سے ۷ منٹ میں با آسانی پڑھی جا سکتی ہے۔

Q.NO.05

پشتو زبان کا شمار دنیا کے قدیم ترین زبانوں میں ہوتا ہے۔ تقریباً ساڑھے پانچ ہزار سال پرانی اس زبان کے پہلے شاعر امیر کروڑ پہلوان کو سمجھاجاتا ہے جنہوں نے ساتویں صدی میں پشتو کی پہلی تحریری نظم لکھی۔ تاہم بعض تاریخ دانوں کا کہنا ہے کہ امیر کروڑ کی شاعری میں پختگی کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ ان سے پہلے بھی پشتو کے شعراء موجود تھے۔

پشتو ادب میں دوسری زبانوں کی کتابوں کے ترجمے کرنے کی روایت مشہور شاعر اور سپہ سالار خوشحال خٹک کے دور میں شروع ہوئی۔ سب سے پہلے خوشحال خان خٹک ہی نے فارسی کے شاعر شیرازی کے شعری مجموعوں کا پشتو زبان میں ترجمہ کیا۔

اگرچہ پشتو شعر و ادب پر مذہبی رحجان ہمیشہ سے غالب رہا ہے تاہم بیسویں صدی میں پہلی بار پشتو اکیڈیمی کابل یونیورسٹی نے مختلف زبانوں سے انقلابی ادب کا پشتو زبان میں ترجمے کا سلسلہ شروع کیا جس سے پشتو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ ساٹھ اور ستر کے دہائیوں میں بھی کئی روسی اور اٹالین ترقی پسند اور انقلابی مصنفین کی کتابوں کے ترجمے کئے گئے جو آج بھی پشتو ادب کا سرمایہ سمجھا جاتا ہے۔

اسّی کے دہائی میں جب روس نے افغانستان پر حملہ کیا تو ایک بار پھر پشتو ادب نے مذہبی اور جہادی رنگ اختیار کیا تاہم اس دوران انگریزی ادب سے پشتو زبان میں مشہور ناولوں کی ترجموں کا سلسلہ بھی بدستور جاری رہا جس کا کریڈیٹ نوجوان نسل کے شعراء اور ترقی پسند لکھاریوں کو جاتا ہے۔

انہی افراد می نوجوان شاعر اور صحافی راشد خٹک کا نام بھی آتا ہے جنہوں نے حال ہی میں مشہور ناول 'الکیمسٹ' کا پشتو زبان میں ' کیمیا گر' کے نام سے ترجمہ کر کے شائع کیا ہے۔ 'الکیمسٹ' برازیلی ناول نگار پاولو کویلہو نے سن انیس سو اٹھاسی میں تحریر کیا تھا اور اب تک سڑسٹھ زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا جا چکا ہے۔ تقریباً ایک سو پچاس ممالک میں پڑھی جانے والی اس کتاب کی اب تک ساڑھے چھ کروڑ کاپیاں فروخت ہوچکی ہیں۔

ناول کا ترجمہ خالص افغانی لہجے میں بڑے آسان اور سہل انداز سے کیا گیا ہے تاکہ اس سے افغانستان میں رہنے والے پشتون بھی مستفید ہو سکیں۔ اس ناول میں سنٹیاگو نامی ایک غریب نوجوان لڑکے کی کہانی بیان کی گئی ہے جو اپنے ایک خواب کی تعبیر کےلیے مصمم ارادہ کرتا ہے اور کئی قسم کے مشکلات کے باوجود ہمت نہیں ہارتا اور بالآخر اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

راشد خٹک کے مطابق انہوں نے اس ناول کا ترجمہ پاکستان اور افغانستان میں رہنے والے پشتونوں کے مسائل کو دیکھتے ہوئے ایک خاص مقصد کے تحت کیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ جس طرح کہانی میں سنٹیاگو کئی قسم کے مشکلات سے دوچار ہوتا ہے عین اسی طرح افغانستان اور پاکستان کے پشتون بھی خانہ جنگی کی صورتحال سےگزر رہے ہیں اور شدت پسندی اور دہشتگردی نے ان کے تمام ادارے تباہ کر دیے ہیں۔

ان کے بقول اگر پشتون بھی موجود حالات سے نکلنے کے لیے پختہ ارادہ کر لیں تو جس طرح کہانی میں تمام قوتوں نے سنٹیاگو کا ساتھ دیا اس طرح وہ بھی ان مشکلات سے نکل سکتے ہیں تاہم اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی حالت بدلنے کےلیے سنجیدہ ہوں۔

اس سے پہلے راشد خٹک افغان ناول نگار سعدالدین شپون کے پشتو ناول کا ترجمہ کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے 'ٹیلز آف اٹلی' کے نام سے میکسم گورکی اور افغان مصنف عبدلوکیل سلولمل شنواری کے مختصر کہانیوں کے ترجمے پشتو، اردو اور انگریزی میں کیے ہیں۔

کورس: پاکستانی زبانیں وادب-II (4658)

سمسٹر: خزاں 2019ء

امتحانی مشق نمبر2

یونٹ (5تا9)

سوال نمبر1-	کشمیری زبان وادب کے مختلف ادوار کا جائزہ لیں۔	(20)
سوال نمبر2-	سرائیکی زبان میں افسانوی ادب کے ارتقا پر نوٹ لکھیں۔	(20)
سوال نمبر3-	بروشکی اور شنا زبان کے لوک ادب کے نوٹ تحریر کریں۔	(20)
سوال نمبر4-	بلتی زبان وادب کس طرح کے اثرات سے متاثر ہوا ہے۔ نیز بلتی شاعری کی خصوصیات تحریر کریں۔	(20)
سوال نمبر5	سرائیکی زبان کے قدیم ادب کی خصوصیات تحریر کریں۔	(20)

Q.NO.01

وطن کے تعلق سے اہل وطن جانے اور پہچانے جاتے ہیں ۔جیسے روس کے باسی روسی،چین کے باسی چینی،پاکستان کے باسی پاکستانی اسی نسبت سے کشمیر میں رہنے والے کو کشمیری کہا جاتا ہے۔ کشمیری زبان جیسے اہل زبان "کاشر "کہتے ہیں وادی کشمیر کے علاوہ دیگر علاقوں میں بولی جاتی ہے۔تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آج سے تقریباً چار ہزار سال قبل یہ وادی ایک جھیل تھی پھر جب یہ جھیل خشک ہوئی تو یہ علاقہ سرسبز و شاداب نظر آنے لگا جس وجہ سے اسے "فردوس برروئے " زمین کہا جانے لگا۔

جب مختلف علاقوں سے یہاں قبائل آباد ہوئے تو یہ قبائل "درد آریائی" زبان بولتے تھے یعنی شینا ،بلتی،چترالی،بروشکی،کوہستانی وغیرہ۔چنانچہ مختلف قبائل کے میل جول اور باہمی معاشرت کے نتیجہ میں کشمیری زبان وجود میں آئی۔محققین کے نزدیک کشمیر میں آج سےسترہ سو سال پہلے اپ بھرنش بھاشا کا چلن ہوا اور اس کے بعد کشمیری زبان نے جنم لیا ۔گویا یہ زبان تیسری صدی عیسوی کی دین ہے۔کشمیری زبان بھارت اور پاکستان میں کثرت سے بولی جانے والی زبان ہے۔بمطابق ۲۰۱۱ء آبادی شماری جموں و کشمیر کی کل آبادی ۱،۲۵،٤۱،۳۰۲(1،25،41،302)ہے جس میں کم و بیش ۹۵،٦۷،۰۰۰ (95،67،000)کشمیری زبان بولنے والے افراد ہیں اور ریاست آزاد جموں و کشمیر میں بھی کشمیری زبان بولی جاتی ہے۔

کشمیری زبان بولنے والوں میں اکثریت مسلمانوں کی ہے ۔کشمیری پنڈت اور سکھ قوم بھی کشمیری زبان بولتے ہیں مگر اصل میں یہ زبان کشمیری مسلمانوں سے ترویج پا رہی ہے ۔کشمیری زبان کی تاریخ 5000سال پرانی ہے اور اس کے علمی ثبوت 2000سال پرانے ہیں ۔کشمیری زبان کا موجودہ رسم الخط فارسی زبان کے مطابق ہے۔ 1947ء کے بعد جب ڈوگرہ شاہی کو زوال ہوا تو کشمیری زبان

نے مقبوضہ وادی کشمیر میں پیر جمانہ شروع کیے اور کئ معتبر مصنف و ادیب اور شاعر منظرِ عام پر آئے ۔کشمیری زبان کی ابتدا بھی باقی زبانوں کی طرح شاعری سے ہوئی ۔

کشمیری شاعری و ادب کو چار ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے دور میں عشق ومحبت کے قصے ہیں اس دور میں گیت کثرت سے لکھے گئے ۔اس دور کا نمائندہ شاعر "شستی کنٹھ" ہے اسے کشمیری زبان کا پہلا شاعر بھی کہا جاتا ہےدوسرا دور (1335ء) عشق و محبت کا دور ہے جس کی نمائندہ شاعرہ حبہ خاتون ہیں ۔اس کی شاعری میں اسلامی تصوف کے ساتھ وصل و ہجر کے رنگ نظر آتے ہیں ۔تیسرا دور (1422ء) فارسی کی آمیزش کا دور ہے۔اس دور میں روحانیت کا عنصر پایا جاتا ہے اس کے روح رواں "محمود گامی" ہیں ۔ کشمیری زبان و ادب کا چوتھا دور (1848ء) جدید ادب کا ہے۔اس دور کے ادب نے نئے فکری رجحانات پیدا کیے۔اس دور کا مشہور شاعر "غلام احمد مہجور " ہے ۔اس دور میں کشمیری ادب نے خوب ترقی پائی۔

کشمیری زبان کی ایک زبردست صوفی شاعرہ للہ عارفہ(للہ دید ایک عارفہ تھی اس لیے مسلمان انہیں للہ عارفہ کہتے ہیں جو سید حسین سمنائی کے ذریعے مسلمان ہوئی) ہیں ۔جیسے اہل کشمیر" لل ماج" اور ہندو "لل ایشوری "کے نام سے پکارتے ہیں ۔اس کے گیت اس دور کے ہر بچے کے زبان پر تھے ۔اس نے بت پرستی کے خلاف آواز اوٹھائی اور توحید کا درس دیا ۔ کشمیری زبان کی دوسری شہرہ آفاق شاعرہ حبہ خاتون ہیں ۔حبہ نے کشمیر میں غزل کو روشناس کروایا ۔حبہ کے علاوہ نورالدین رشی، محمود گامی، رسل میر، غلام احمد مہجور، عبدالاحد آزاد ، شمس فقیر جیسے عظیم شاعروں نے کشمیری زبان کے ادب کو عروج بخشا۔کشمیری زبان کا نثری ادب بھی موجود ہے اور آج کشمیری بین الاقوامی زبان ہے۔

تقسیم ہند کے بعد جو سماجی تبدیلیاں برصغیر میں رونما ہوئیں اس کی لپیٹ میں کشمیری زبان بھی آ گئ ۔جس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ریاست جموں و کشمیر کی سرکاری زبان کشمیری کی بجائے اردو قرار دی گئی اور بات کروں میں اگر مقبوضہ وادی کی وہاں بھی ایسی ہی صورت حال دیکھنے کو ملتی ہے ۔میں بحثیتِ کشمیری آذاد کشمیر کی حکومت سے مطالبہ کرتا ہوں کہ مطالعہ کو کم از کم میٹرک کی سطح تک لازمی مضمون کی حثیت سے پڑھایا جائے تاکہ ہماری نوجوان نسل بھی تاریخ کشمیر سے واقف ہو اور حکومت کو چاہیے کہ وہ سیمیناروں کا انعقاد کرے جہاں کشمیری زبان کے حوالے سے لوگوں کو آشنا کروایا جائے ۔آذادکشمیر میں کشمیریات کا شعبہ تنزلی کی طرف بڑھ رہا ہے اور آذادکشمیر کی اکثریتی آبادی کشمیری زبان سے لا علم ہے ۔اس مسلۂ کا حل ممکن ہے

مجھے کشمیری ہونے پر فخر ہے

Q.NO.02

سرائیکی ادب میں کہانی سے افسانے تک کا سفر بہت طویل ہے۔ اگر افسانے کی آج کی شکل کی طرف نظر دوڑائی جائے، تو غلام حسن حیدراٹی اور تحسین سبائے والوی کے نام آتے ہیں۔ ''غلام حسن حیدرانی دے افسانے'' جہاں عام قاری کے لیے اہمیت رکھتے ہیں، وہاں سرائیکی طالب علموں کی بہت بڑی ضرورت بھی پوری ہوگئی۔ اس مجموعے میں پائے جانے والے دس افسانے وسیب کے ساتھ مضبوط رشتے کا ثبوت ہیں۔

سرائیکی کے کچھ افسانہ نگاروں نے اردو زبان کے جدید ادب سے متاثر ہو کر بہت جلد سرائیکی میں علاقائی افسانہ شروع کیا، ان میں عامر فہیم، بتول رحمانی، مسرت کلانچوی جیسے افسانہ نگار نمایاں ہیں۔ انہوں نے تہذیبی اور ثقافتی زندگی پر اپنے افسانے کی بنیاد رکھنے کی بجائے ایک متحرک جدید زندگی کو اپنا موضوع بنایا۔ عامر فہیم کی کتاب ''جاگدی اکھ دا خواب'' اور احسن واگھا کے افسانوی مجموعے ''تھل کرن دریا'' اور ''آدی واس'' جیسی کتابیں لکھی گئیں۔ 1948ء میں اوچ شریف کے آصف اچوی نے 'جھاڑو دا تیلا'' کے عنوان سے سرائیکی افسانہ لکھا مگر 1969ء کا سال سرائیکی افسانے کے حوالے سے یادگار سال ثابت ہوا۔ اس سال سے باقاعدہ سرائیکی افسانے کا آغاز ہوا۔ اس سال پہلا ترجمہ شدہ افسانہ اکرم فریدی کا شائع ہوا اگرچہ قاسم جلال کی متفرق نثری صنفوں کا مجموعہ ''ہنجوں تے ہیرے'' اگست 1976ء میں شائع ہوا جس میں ایک افسانہ بھی تھا، تاہم سرائیکی افسانوں کا پہلا مجموعہ ''اچی دھرتی جھکا آسمان'' خاتون افسانہ نگار مسرت کلانچوی کی کاوش تھا۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی ''سرائیکی ادب ریت تے روایت'' میں لکھتے ہیں: ''سرائیکی زبان و ادب کا نثری سرمایہ بہوں کم ہے۔ دس بارہ سالوں میں نثر کی طرف توجہ دی گئی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تعلیم یافتہ لوگوں نے سرائیکی لکھنی شروع کر دی اور اس طرح دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ سرائیکی کے نثری ادب میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے۔

اس سلسلے میں دلشاد کلانچوی ''سرائیکی اور اس کی نثر'' میں لکھتے ہیں: ''اردو ہی کی طرح سرائیکی افسانے کے وجود میں آنے سے پہلے لوک داستانیں اور لوک کہانیاں وجود میں تھیں۔ ایسی داستانوں میں عوامی تفریح، انسانی تجربوں کا نچوڑ اور زبان کی چاشنی وافر پائی جاتی تھی۔ ان میں تھلّوں اور صحراؤں کی بیکرانی، پہاڑوں کی عظمت، دریاؤں کی روانی، دیہاتی معاشرہ کی سادگی اور فصلوں کی خوشبوئیں رچی ہوتی تھیں۔ ان کے کردار عوامی زندگی کے سچے ترجمان ہوتے تھے، گویا اردو داستانوں اور کہانیوں کی خوشبو بھی ان میں موجود تھی۔ ان لوک کہانیوں میں رومان بھی

تھا۔ پیروں فقیروں اور بزرگوں کے قصے بھی تھے۔ بہادری و دانشمندی، عدل و انصاف، خانگی تعلقات اور جھگڑے تنازعے وغیرہ جیسے موضوعات کو بھی جگہ دی جاتی تھی اور فکرِ روز گار بھی تھا۔''وہ مزید لکھتے ہیں: ''قومی زبان اردو کی طرح سرائیکی میں بھی پرانے قصے کہانیوں اور داستانوں میں دوسرے موضوعات کے علاوہ جنوں، پریوں کی باتیں ہیں۔ جادوگروں کے کارنامے اور کرشمے بھی ہیں لیکن جب سے انسانی شعور نے پلٹا کھایا ہے، تو ان قصوں کہانیوں اور داستانوں کا جنوں بھی کم ہو گیا ہے بلکہ ان کی بجائے نثری ادب کی ایک نئی اور مختصر صنف وجود میں آ گئی ہے جسے عام طور پر افسانہ کہا جاتا ہے۔ اگرچہ اردو افسانے کا آغاز پہلے ہو چکا تھا لیکن سرائیکی افسانے کا آغاز قیامِ پاکستان کے بعد سے ہوا ہے، اگر اس سے قبل کوئی افسانے لکھے گئے ہیں، تو وہ شائع نہ ہو سکنے کی وجہ سے ضائع ہو چکے ہیں، یا گمنامی کی قبروں میں دفن ہو چکے ہیں۔ علاوہ ازیں نشر و اشاعت کی سہولتیں بھی نہ ہونے کے برابر رہی ہیں۔ اس پر تقسیمِ ملک کی اتھل پتھل رہی ہے۔ حالات مخدوش سے رہے ہیں۔ ایسے حالات میں یہ بھی وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ سب سے پہلا سرائیکی افسانہ کس نے لکھا اور کب لکھا، لیکن قراین و قیاس یہی ہے کہ افسانہ نگاری کی روش قائم رہی اور افسانے لکھے جاتے رہے۔''

بہاولپور سے دو چار رسالے بھی چھپے، لیکن ان میں سرائیکی زبان و ادب کا گزر نہ ہوچکا، اگر کچھ ہوا بھی تو اتنا کہ زیادہ تر نثر اردو میں سرائیکی زبان و ادب کے کچھ چرچے ہوتے رہے، وہ بھی صرف رسالہ ''الفرید'' میں۔ سرائیکی زبان و ادب کی تاریخ میں ''پنجند'' کے نام سے 1950ء میں سرائیکی زبان کا پہلا رسالہ کراچی سے شائع ہوا۔بدقسمتی سے اس وقت کا کوئی شمارہ دستیاب نہ ہو سکنے کی وجہ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں کون سے اور کس کس کے افسانے شائع ہوئے ہوں گے۔ اس رسالہ کے 24 صفحے ہوتے تھے۔ بہرحال سرائیکی کا یہ رسالہ بھی چھے مہینے کے بعد بند ہو گیا تھا۔ پندرہ سولہ سالوں کے بعد بہاولپور سے ایک اور رسالہ جاری ہوا۔ اس کا نام ''سرائیکی'' رکھا گیا۔ یہ رسالہ بالخصوص سرائیکی زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے سلسلے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس رسالہ میں بالاہتمام نظم و نثر میں سرائیکی مضامین چھپنے لگے اور سرائیکی افسانے بھی جگہ پانے لگے۔ یہ رسالہ جون، اکتوبر 1965ء سے شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ سب سے پہلا باقاعدہ افسانہ جولائی 1976ء میں شائع ہوا۔ اس افسانے کا عنوان ''شہید'' تھا۔ یہ پہلا مطبوعہ افسانہ تحسین سبائے والوی نے لکھا تھا۔ پھر مارچ 1968ء کو دلشاد کلانچوی کا افسانہ ''روہی دا ہک خواب'' اسی رسالے میں شائع ہوا۔ انہی دنوں جگو والا (ملتان) سے ہفتہ وار ''اختر'' نے بھی سرائیکی ''ماہانہ ایڈیشن'' نکالنا شروع کردیا تھا۔ یہ ہفتہ وار 1964ء سے شائع ہو رہا تھا۔

اس میں بھی سب سے پہلے 24 اگست 1968ء کے شمارے میں افسانہ ''سہارا'' چھپا۔ جسے تحسین سبائے والوی نے ہی لکھا تھا۔ اس طرح سرائیکی افسانے نے سرپیر نکالنے شروع کردئیے۔ اس ہفتہ وار اخبار ''اختر'' نے ستمبر، اکتوبر 1969ء کا مشترکہ شمارہ ''افسانہ نمبر'' کی شکل میں شائع کیا۔ اس میں نو افسانے شامل تھے جو اسماعیل احمدانی، غلام حسین حیدرانی، اختر علی بلوچ، محمد رمضان طالب، سجاد بریلوی، نجمہ کوکب وغیرہ کے لکھے ہوئے تھے۔ سرائیکی افسانہ نگاری کی تاریخ میں یہ شمارہ ایک سنگِ میل کے طور پر یاد کیا جائے گا۔ اس افسانہ نمبر میں زیادہ تر نئے افسانہ نگار تھے، پھر بھی دوچار نام ایسے بھی شامل ہیں جو مشہور و معروف ادیب ہیں اور جنہوں نے بعد میں بھی افسانہ نگاری سے لو لگائے رکھی۔ یہ حضرات سرائیکی افسانہ نگاروں کے سرخیل بنے۔ انھوں نے افسانہ کے میدان میں سرائیکی زبان و ادب کی بے مثال خدمت کی، اگرچہ یہ حضرات پرانی طرز کے افسانے لکھنے والے تھے، مگر بعض نے نئے تجربے بھی کیے۔ اختر علی بلوچ نے زیادہ تر تاریخی واقعات کو افسانے کا چولا پہنایا۔ اسماعیل احمدانی کچھ ڈھیلے پڑگئے، غلام حسن حیدرانی اپنی مثنوی ''ممی'' اور ''گلو'' میں مصروف ہو گئے۔ لیکن تحسین سبائے والوی نے افسانہ نگاری کو جاری رکھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے باقی حضرات کے مقابلے میں زیادہ تعداد میں افسانے لکھے۔ ادھر رسالہ سرائیکی بہاولپور کے توسط سے بھی کئی افسانہ نگار متعارف ہوئے۔ ان میں سب سے پہلے ظفر لشاری سامنے آتے ہیں۔ رسالہ ''سرائیکی'' بہاولپور نے ایک سرائیکی افسانہ نگارہ کو بھی متعارف کرایا۔ یہ مسرت کلانچوی ہیں۔ یہ پہلی افسانہ نگار خاتون ہیں جنھوں نے اپنے سرائیکی افسانوں کا ایک باقاعدہ مجموعہ ''اچی دھرتی جھکا اَسمان'' کے نام سے شائع کرایا جو بہت مقبول ہوا۔ ان کے دیکھا دیکھی کئی افسانہ نگار خواتین میدان میں آئیں۔ چنانچہ مل جل کر آج ہمارے سرائیکی خواتین افسانہ نگاروں کی ایک اچھی بھلی کھیپ پیدا ہو چکی ہے۔

Q.NO.03

زبانوں کی علاقائی اور مشابہتی درجہ بندی کے برعکس زبانوں کا وراثتی تعلق لسانی درجہ بندی کے لیے اب بھی ایک بڑا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ وراثتی تعلق کا مطلب کوئی دو زبانیں بولنے والے گروہوں کا حیاتیاتی رشتہ نہیں ہے بلکہ دنیا کی مختلف زبانوں کو ان کے مشترک اجداد کی بنا پر مختلف گروہوں یا خاندانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کسی زبان کی ابتدا کو بعض اوقات پروٹو لینگویج یا ابتدائی زبان سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ہے۔ ابتدائی کلاسیکی آریائی زبان کے بعد ہند Proto Classic Aryan چنانچہ شینا زبان کا لسانی جد یورپی زبانوں کا درجہ آتا ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو ہند ایرانی زبانوں کا بڑا خاندان ایرانی، نورستانی اور ہند آریائی زبانوں کے مزید خاندانوں میں بٹ جاتا ہے۔ اس لحاظ سے آریائی زبانوں کے دو بڑے گروہ بنائے گئے ہیں ایک گروہ شمال مغربی اوردوسرا گروہ وسطی کہلاتا ہے اور شینا کا تعلق زبانوں کے ہند شمالی مغربی گروہ کے تحتی درد خاندان سے ہے جس کی قدامت کا اندازہ پانچ ہزار سال پر محیط ہے۔ اس گروہ میں تقریباً 13 زبانیں بولنے والے گروہ شامل ہیں۔

زبانوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ شینا کی ابتدا وسط ایشیا میں کاکیشیا کے میدانوں اور وادیوں میں ہوئی۔ شینا بولنے والے تاریخ کے مختلف ادوار میں نقل مکانی کرتے رہے ہیں اور اس نقل مکانی کی تاریخ کےبارے میں تین مفروضے قائم کئے جاتے ہیں:

میں اس مضمون میں ان تینوں مفروضوں میں سے زیادہ قرین قیاس مفروضے پر بحث کرنا چاہتا ہوں۔ ایک زیادہ قرین قیاس مفروضہ یہ بتاتا ہے کہ شینا بولنے والے کاکیشیا کی وادیوں سے اٹھ کر براستہ جہلم کشمیر کی وادی میں وارد ہوئے ہوں اور طویل مدت وادئ کشمیر میں رہے ہوں۔کشمیر کی مضافاتی وادیوں گریس، دراس، کارگل اور لداخ میں شینا بولنے والوں کی موجودگی اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ شینا بولنے والے کشمیر کی وادی میں رہے ہوں گے۔ راج ترنگنی سے اس موجودگی کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔

آثار اس بات کے شاہد ہیں کہ شاید کسی دوسرے گروہ کی نقل مکانی کی وجہ سے شینا بولنے والوں کو راست شمال کی طرف دھکیل دیا گیا ہواور وہ وادی سے نکل کر موجودہ شینا بولنے والی وادیوں E. F میں پھیل گئے ہوں۔ پھر بوجوہ ان وادیوں سے نکل کر شمالی علاقہ جات میں وارد ہوئے ہوں۔ میں ان آثار پر 'Oxus and Indus' اور 'Where Three Empires Meet' کی کتاب Night بحث موجود ہے۔

مختلف ادوار میں نقل مکانی کے سبب شینا بولنے والوں نے اپنی ہمسایہ زبانوں سے بہت اثر اور aerial لیا۔بروشسکی کی ہمسائیگی کے سبب شینا کی صوتی حالت اور گرائمر کچھ فرق کے ساتھ بروشسکی سے بہت ملتی جلتی ہے جبکہ شینا اور بروشسکی کا صوتی typological بھی بالکل ایک جیسا ہے۔ اس لیے ان دو زبانوں pitch accent pattern نظام اور ان دو زبانوں کا نے ایک دوسرے سے الفاظ کی صورت میں بھی بہت کچھ لیا ہے۔ ثقافتی لحاظ سے جب ہم شینا، بروشسکی اور کھوار کے سوچنے کے عمل کی نچلی تہوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو "بِٹن" اور "دنّیل" کی وجدانی زبان شینا ہو نے اور بروشسکی رزمیے کا شینا ہونا اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ ان زبانوں

کا ثقافتی عمل ایک ہی نوع کے سوتے سے پھوٹا ہو گا۔
شینا زبان بولنے والوں کا سماجی ڈھانچہ قبائلی رہا ہے۔ ان کی زندگی گلہ بانی و کسانی رہی ہے ایسی حالت نے اکثر انہیں تمدن کے مراکز اور شہری زندگی سے دور رکھا ہے۔ وہ اکثر پہاڑوں کی وادیوں میں زندگی گذارتے رہے ہیں جس کی وجہ سے شینا نے اپنے خاص حالات میں اپنے طور نشونما پائی ہے۔ ان حالات اور ماحول کو اگر نظر میں رکھا جائے تو شینا بے حد ثروت مند زبان ہے۔ الفاظ کا ذخیرہ بے اندازہ اور فراواں ہے جو اس کی مستقل ترقی کا ضامن ہے۔
کاروباری، تکنیکی اور علمی اصطلاحات شینا بھی دیگر زبانوں کی طرح مستعار لے رہی ہے اور وہ اردو کے ذریعے لے رہی ہے۔
شینا اگرچہ قدیم ہے اس میں کلاسیکی شاعری اور لوک ادب کا بے اندازہ ذخیرہ موجود ہے جو سینہ بہ سینہ چلا آرہا ہے۔ لیکن تمدنی آسائشوں کے نہ ہونے کے سبب شینا میں تحریر کی صورت بہت دیر کے حوالے سے سامنے آیا ہے کہ شینا بولنے Lipi بعد پیدا ہوئی۔ ایک نظریہ ابھی حال ہی میں لپی niilo اور نیلوٗ بٹ saargin والوں کے کسی تمدنی دور میں لِپی ان کا تحریری نظام رہا ہو۔ سارگن کے آثار اس بات کا بخوبی پتہ دیتے ہیں کہ شینا بولنے والے ایک تمدنی دور سے گذرے ہیں baṭ لیکن ان کا مذہبی اور تحریری ورثہ زمانے کے دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکا۔ لہٰذا شینا پہلی بار 1893 میں محکمہ بندوبست کے ایک نائب مہتمم ٹھاکر سنگھ نے لکھنے کی کوشش کی۔جبکہ اس ٹی گراہم بیلی نے شینا گرائمر لکھ (T. Graham Baily) بارے میں باقاعدہ کام کا آغاز 1924 میں کر کیا۔ شینا کو باقاعدہ طور پر اردو رسم الخط میں ڈالنے والا پہلا شخص محمد امین ضیا ہے جس نے شینا گرائمر اور شینا صوتیات مرتب کر کےشینا کوابتدائی باقاعدہ صوتی حروف بہم پہنچائے۔ لیکن کا درپیش ہوتا ہے جس کا تجزیہ حاصل ہونے کے بعد Phonemics صوتیات سے اگلا مرحلہ فونیات ان تمام صوتی آوازوں کو فونیاتی اکائیاں قرار دیا جاتا ہے۔ ان حاصل شدہ صوتی آوازوں کے تجزیے سے میسر آنے والی فونی اکائیاں کسی زبان کے لفظ کی بناوٹ میں معنوی صورت کی حامل ہوتی ہیں۔ اس بات سے معلوم ہوا کہ صوتی حرف کسی زبان کے لیے معنوی صورت کا درجہ نہیں رکھتا بلکہ کسی زبان میں موجود ایک آواز کی غیر مرتب صورت ہے۔ اس ضمن میں ان صوتی حروف کو فونی حروف کی صورت دینے والا پہلا شخص عبد الخالق تاج ہے جن کا شینا قاعدہ حوالے کا درجہ رکھتا ہے
شینا صوتیات و فونیات پر جدید لسانیاتی بنیادوں پر کام کا آغاز سمر انسٹٹیوٹ آف لنگوسٹکس کی ماہر مرتب کر کے کیا۔ اب Aspects of the Sounds of Gilgiti Shina لسانیات کرلا ایف ریڈلاف نے

شینا زبان کی پشت پر ایک باقاعدہ تحقیق شدہ صوتیات و فونیات کا کام موجود ہے جس کو سامنے رکھ کر ایک باقاعدہ علم
الاصوات پر مبنی لکھائی کے نظام کو تشکیل دیا گیا ہے۔
یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ پڑھائی لکھائی کا نظام فونیات کے مرحلے پر آ کر ایک باقاعدہ لکھائی کے نظام کا روپ نہیں دھار سکتا، بلکہ یہ عمل ایک اگلے مرحلے میں داخل ہوتا ہے جہاں اس کا تعلق سماج کی سوچ، اس کے رویے اور اس کی سیاسی تنظیم اور اس سے پیدا ہونے والی فکر سے مربوط ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس مرحلے میں جمہور کی طرف سے کسی نئے مجوزہ نظام پڑھائی لکھائی کو پزیرائی مل سکتی ہے یا اسے نا پسند کیا جا سکتا ہے۔ اس پزیرائی یا نا پسندیدگی کے عمل کو وقوع پذیر کرنے کے لیے اس سماج کے زبانی روایتی ادب کو جو ان کے حافظے میں کسی حد تک محفوظ ہوتا ہے پیش کیا جاتا ہے۔ اگر لکھائی کا نظام علم الاصوات پر مبنی نظام ہے تو وہ جمہور کے ذہنی خاصے کی عکاسی کرے گا اور ایک مستقل لفظی شکل کی صورت اختیار کرے گا۔
لہٰذا اس کام نے شینا کو لکھنے کے لیے "علم الاصوات پر مبنی باقاعدہ لکھنے کا نظام" بہم پہنچایا۔
اب ہم تاریخ کے اس دھانے کھڑے ہیں جہاں سے شینا کے لوک ادب کو تحریر کی صورت دینے اور جدید شینا ادب پیدا کرنےکاسفر شروع کیا جاتا ہے۔
ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم شینا لینگویج کمیونٹی کے ادیب، شاعر اور تحقیق کار سر جوڑ کر شینا کی ترقی اور ترویج کے لیے ایک پلیٹ فارم پر متحد ہوجائیں۔ تاکہ ہم شینا کو اس کی اصلی شکل میں نئی نسل کو منتقل کر سکیں۔

Q.NO.04

گلگت بلتستان جس طرح اپنی جغرافیائی حیثیت کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے بالکل اسی طرح مختلف زبانوں، تہذیب و تمدن اور منفرد ثقافت کی بدولت اپنا منفرد مقام رکھتا ہے۔ مختلف زبانیں اس خطے کی اہمیت کو دنیا بھر میں دوبالا کر دیتی ہیں۔ بنیادی طور پر اس خطے میں پانچ بڑی زبانیں بولی جاتی ہیں جن میں شینا، بلتی، بروشسسکی، کھوار اور وخی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ چھوٹی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں جن میں گوجری، داودی یعنی ڈوماکی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔
بلتستان کے تمام اضلاع میں تقریباً 90 فیصد بلتی بولی جاتی ہے جب کہ کچھ علاقوں میں شینا بھی بولی جاتی ہے۔ دیامر، استور، گلگت اور غذر کے مختلف علاقوں کے علاوہ ہنزہ نگر کے بعض

علاقوں میں بھی شینا بولی جاتی ہے۔ بروشسکی زبان ضلع غذر کے تحصیل یاسین، ہنزہ اور نگر میں اکثریتی طور پر بولی جانے والی زبان ہے۔ اسی طرح کھوار ضلع غذر کے علاقے اشقمن ” اشکومن“، پھنڈر، گوپس اور یاسین میں بولی جاتی ہے۔ گلگت بلتستان کا تاریخی حصہ چترال جو اب خیبر پختون خوا میں شامل ہے میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان کھوارہے اور وخی زبان ہنزہ کے علاقے گوجال ،شمشال اور ضلع غذر کے علاقے اشقمن میں بولی جاتی ہے۔

صدیوں سے گھل مل کر آپس میں رہنے کی وجہ سے خطے کے لوگ ایک دوسرے کی زبانیں آسانی سے بولتے اور سمجھتے ہیں اور اس تاریخی روابط کی بدولت کچھ الفاظ مشترکہ طور پر اکثر و بیشتر استعمال ہوتے ہیں اور کچھ ایسے الفاظ بھی مشترکہ بولی کے باعث ایجاد ہوئے ہیں جن کو پڑھنے کے بعد یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ بنیادی طور پر کس زبان کے الفاظ ہیں۔ اس طرح کے الفاظ خاص کر بروشسکی اور کھوار میں پائے جاتے ہیں۔ جیسے بروشسکی میں تَتی والد، نَنی والدہ کے لیے بولا جاتا ہے جب کہ ان سے ملتے جلتے الفاظ تَت والد، نَن امی کو کھوار میں کہتے ہیں۔ دونوں زبانوں میں اب یہ فرق کرنا مشکل ہے کہ یہ الفاظ بنیادی طور پر کھوار کے ہیں یا بروشسکی کے۔

بالکل اسی طرح اگر ہم شینا زبان کی بات کریں تو اس میں بھی بہت سارے الفاظ شینا اور بروشسکی میں مشترکہ طور پر ایک ہی مطلب کے لیے استعمال ہوتے ہیں ۔ اس طرح کے بے شمار الفاظ موجود ہیں جن پر بات کی جاسکتی ہے اور بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے لیکن بد قسمتی سے ان زبانوں کو تحریری شکل میں زندہ رکھنے کی ضرورت پر بہت کم غور کیا گیا جس کی وجہ سے یہ زبانیں زوال کا شکار ہیں۔

بلتی زبان میں ادب

بلتستان اور کرگل لداخ میں بولی جانے والی سب سے بڑی زبان بلتی پر کسی حد تک کام کیا گیا ہے۔ اس زبان کا اپنا رسم الخط موجود ہے اور بلتستان کے بڑے بڑے شاعرا غلام حسن حسنی، پروفیسر حشمت کمال الہامی، احسان دانش، میر اسلم سحر اور دیگر ادیبوں نے بلتی ادب و شاعری، گیت، حمد و نعت، سفرنامے اور بلتی لغات پر کام کیا جس کی وجہ سے اس زبان کا مستقبل درخشاں ہے۔ تاہم اس کے تحفظ کے لیے مزید کام کی ضرورت ہے۔

شینا زبان میں علم و ادب کی تدوین وتخلیق

اگر ہم شینا زبان کی بات کریں تو اس زبان پر بھی ماضی میں بہت زیادہ کام نہیں ہوا۔ البتہ پرانے شعراء رحمت جان ملنگ، فضل الرحمان عالمگیر مرحوم، بابا چیلاسی اور ان کے بعد جان علی جانان،

جمشید خان دکھی، عبدالخالق تاج، امین ضیا، شکیل احمد شکیل، عزیزالرحمان ملنگی، امتیاز حسین شہکی، ظفر وقار تاج جیسے مایہ ناز شعراء، ادیب اور گلوکاروں نے کام کیا۔ جن کی محنت کے باعث اس وقت دیگر چھوٹی زبانوں کے مقابلے میں شینا ادب و شاعری عروج پر ہے۔ جس کی مثال رحمت جان ملنگ اور دیگر کے شینا شعری مجموعے ہیں۔ شاعری کے علاوہ شینا رسم الخط پر بھی کسی حد تک کام ہوچکا ہے۔ تاہم آپس میں بیٹھ کر بحث مباحثے کے بعد کسی ایک انداز میں مل کر کام کرنے کی اشد ضرورت ہے ورنہ شینا کا حشر بھی وہی ہوگا جو دیگر زبانوں کا ہو رہا ہے۔

بروشسکی زبان میں ادب و علم کی تخلیق

اب آتے بروشسکی کی طرف۔ اس زبان کی بد قسمتی یہ رہی ہے کہ اس کے بولنے والے کسی ایک مخصوص جغرافیے کے اندر نہ ہونے کے باعث ایک ہی زبان بولنے والوں کی آپس میں دوریاں بڑھ رہی ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ بروشسکی بولنے والے نگر، ہنزہ اور یاسین میں آباد ہیں اور تینوں جگہوں کی بولی ایک دوسرے سے تھوڑی مختلف ہے۔ جس کی بنیادی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کو دیگر زبانوں نے متاثر کیا اور اس کے تحفظ کے لیے کام نہیں ہوا اور بدقسمتی سے یہ تین حصّوں میں تقسیم ہوئی۔ جن میں نگرے بروشسکی، ہنزہ بروشسکی، اور یسینے بروشسکی مشہور ہیں۔

اس زبان پر انفرادی طور پر کسی حد تک کام کرنے کی کوشش کی گئی لیکن اجتماعی طور پر اس پر کام نہیں ہو سکا۔ ہنزہ میں بابائے بروشسکی علامہ نصیرالدین نصیر ہنزائی نے اپنے انداز میں ہنزہ بروشسکی کے لیے بہت زیادہ کام کیا اور ان کی بروشسکی لغات اور شاعری کی تصانیف قابلِ ذکر ہیں۔ جب کہ وہاں زبانی شعر و ادب پر شیر باز ہنزائی، شاہد اختر قلندر، محسن اسیر، ڈیرو اقبال اور دیگر شعراء نے کام کیا۔ اسی طرح نگر میں سید یحیٰ شاہ، اسماعیل ناشاد و دیگر کی خدمات قابلِ ذکر ہیں۔

اسی طرح یسینے بروشسکی پر بہت بعد میں کام شروع ہوا بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہاں پرانے شاعر مچھی بپ "دادامچھی" اور جمائیل خان کے بعد شاعری میں ایک جنریشن کا گیپ آیا اور ان کے بعد کے جنریشن نے شعر و ادب پر کام نہیں کیا اور جنہوں نے کیا ان کی شاعری میں بروشسکی سے زیادہ اردو الفاظ شامل ہوگئے اور شاعری کا معیار نہ ہونے کے باعث عوام میں سوائے چند ایک کے کسی کو پذیرائی نہیں ملی لیکن پھر بھی عبدالمالک، شکورمن کلیم، علی مدد بائے اور دیگر نے اس علم کو ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ یسینے بروشسکی میں پہلی بروشسکی ڈکشنری "بروشاسکی رژون" کے نام سے منظر عام پر آئی جس کا مصنف نوجوان اسکالر ایڈوکیٹ وزیر شفیع ہے۔

اس ڈکشنری کے آنے کے بعد بھی ایک طویل عرصہ گزر گیا مگرکوئی اشاعت نہیں ہوئی۔ لیکن بعد میں اچانک یسینے بروشسکی کے نام سے ایک شاندار کتاب لکھی گئی۔ اس کتاب کے مصنف کا نام عبدالحمید خان ہے جس نے اپنی طویل جلاوطنی کے دوران کتاب کی طباعت و اشاعت کو ممکن بنایا۔ اس کتاب کے منظر عام پر آنے کے بعد بروشسکی زبان پر کام آب و تاب کے ساتھ شروع ہوا۔ ایک دو سال بعد اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بھی منظر عام پر آیا جس سے نوجوان قلم کاروں اورشاعروں کے لیے نیا راستہ مل گیا اور اب "لوظینگے پوٹالو" کے نام سے معروف بروشسکی محقق و ادیب عبدالحمید خان کی لکھی گئی بروشسکی ڈکشنری طباعت و اشاعت کے مراحل میں ہے۔

ساتویں صدی میں تبت کے بادشاہ سترونگ ستان گمپو نے اپنے وزیر تھونمی سامبھوتہ کو ہندوستان بھیجا تاکہ وہ وہاں جاکر مختلف زبانوں کے طرز تحریر کا مطالعہ کرے اور تبتی زبان کے لئے اس کے صوتی تقاضوں کے مطابق رسم الخط تیار کر سکے۔ وزیر کو سرکاری خزانے سے اخراجات کے ساتھ روانہ کیا گیا تاکہ وہ عمیق مطالعہ کے بعد رسم الخط ایجا د کر کے لاسکے۔ اُس دور میں سنسکرت زبان کو ہندوستان میں بڑا عروج حاصل تھا۔انھوں نے سنسکرت سمیت مختلف زبانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد بلتی کے لئے ایک رسم الخط ایجاد کیا جو تیس حروف اور چاراعرابی علامات پر مشتمل تھا ۔باقاعدہ رسم الخط کی ایجاد کے بعد تبتی زبان نے بڑی ترقی کی۔اس زبان میں بڑا ادبی ورثہ تخلیق ہوا۔

بلتی زبان نے تبتِ خورد بلتستان میں بھی بڑی ترقی کی لیکن اشاعت اسلام کے بعد بلتستان میں بلتی زبان کے تبتی رسم الخط کو ترک کیا گیا۔ دوسری جانب بلتستان میں اسلام کے آنے کے بعد بلتستان کے لئے بھی تبت کی مرکزیت کی حیثیت ختم ہو گئی۔ ان عوامل نے خطے میں بلتی زبان کی جامعیت کو متاثر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ آہستہ آہستہ بلتی زبان نے ایک بولی کی شکل اختیا ر کر لی۔ بلتستان میں بلتی زبان کے لئے اب فارسی اور عر بی رسم الخط کو اپنایا گیا ہے۔ کئی عشروں میں تخلیق پانے والا ادبی ورثہ بھی اسی رسم الخط میں موجود ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بلتی زبان اتنی کمزور ہوتی چلی گئی کہ اب اس کا مستقبل خطرے میں پڑنے لگا۔

بلتی زبان اُن زبانوں میں شامل ہوگئی ہے جو عنقریب ختم ہو نے جارہی ہیں۔ جس کو یہاں کے ادیبوں اور محققین نے شدّت سے محسوس کیا۔ بلتی زبان کے تحفظ کے لئے جو قدم سب سے پہلے اُٹھا یا گیا وہ بلتی کیلئے موجودہ رائج رسم الخط کو بلتی زبان کے تقاضوں کے مطابق ڈاھلنا تھا۔ کیونکہ فارسی رسم الخط بلتی زبان کے صوتی تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر تھا۔بلتی میں کئی آوازیں ایسی ہیں جن کے لئے فارسی رسم الخط میں حروف موجود نہیں تھے۔ اس مقصد کے لئے محقق و

ماہر لسانیات محمد یوسف حسین آبادی کی تحریک پر ادبی تنظیم حلقہ علم و ادب کے پلیٹ فارم سے ادیبوں کے اجلاس میں سات اضافی حروف پر اتفاق کیا گیا جو کچھ حروف پرنقطوں اور علامات اضافے کئے گئے۔

1990ء میں ان نئے حروف کے ایجاد ہونے کے بعد بلتی زبان کے لئے فارسی رسم الخط کو اب مکمل تصوّر کیا جانے لگااور بلتی ادب کے فروغ میں تیزی آئی۔ یوں تسلسل کے ساتھ بلتی شعری اور نثری ادب تخلیق ہونے لگا۔رسم الخط کے مکمل ہونے کے بعد جو اہم ادبی کام ہوئے اُن میں بلتی زبان میں قرانِ مجید کے ترجمے کی اشاعت اور بلتی اُردو لغت کی اشاعت خاص طور پر قابلِ ذکرہے۔ اشاعتی کام سامنے آتے ہی اس راہ میں حائل نئے مسائل نے سر اُٹھانا شروع کردیا۔ پہلے یہ مسئلہ شدت کے ساتھ سامنے آیا کہ یونی کوڈ سمیت اُردو ٹائپنگ کے کسی بھی پروگرام میں بلتی حروف تہجی میں شامل اضافی حروف موجود ہی نہیں تھے۔ یہ سارے پروگرام بلتی کے اِن اضافی حروف کو ٹائپ کرنے سے قاصر تھے۔ اس مقصد کے لئے بلتستان کے نامور محققین و مصنفین نے جد وجہد شروع کی۔ قلم کاروں کی درخواست پر گلگت بلتستان کے اُس وقت کے ڈپٹی چیف ایگزیکٹیو حاجی فدا محمد ناشاد نے وسائل فراہم کئے جس کی بنیاد پر ایک سافٹ ویئر انجینیر کی خدمات حاصل کی گئیں۔ یہ سافٹ ویئر بلتی اور شینا دونوں زبانوں کے لئے مشترکہ بنائے جانے کا فیصلہ ہوا جس کے لئے بلتی اور شینا دونوں کے ماہرین نے متفقہ طور پر دستاویز پر دستخط کئے۔ان اضافی حروف کے لئے بڑی تک و دو کے بعد ایک سافٹ ویئر تیار کیا اور اُردو اِن پیج میں بلتی کے اضافی حروف شامل کئے گئے۔ لیکن یہ مسئلے کا حل ثابت نہیں ہوا کیونکہ اضافی حروف اس پروگرام میں جو شامل کئے گئے تھیوہ سائز میں اُردو کے دیگر حروفِ تہجی میں چھوٹے تھے۔ جس کے باعث جملوں کی خوبصورتی متاثر ہونے کے ساتھ بعض حروف اتنے چھوٹے تھے کہ دورانِ اشاعت وہ یا تو مدھم رہتے یا پھر غائب ہی ہوجاتے۔یوں یہ کامیاب نہیں ہو سکا اور اس ضمن میں کی گئی ساری محنت رائگان گئی اور نئے سرے سے سافٹ ویئر کی تیاری کے لئے مختلف اداروں اور ماہرین سے رابطے کا سلسلہ شروع کردیا گیا۔ اس مسئلے کو بنیاد بناتے ہوئے بلتی زبان و ادب کے فروغ کے کام کو روکا نہیں جاسکتا تھا۔

بلتی زبان کو ختم ہونے سے بچانے کے لئے اس کو فوری طور پر سکولوں کی سلیبس میں شامل کرنے کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اس پر کام کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس مقصد کے لئے بلتستان دائرہ مصنفین کے بانی اراکین محمد یوسف حسین آبادی، محمد حن حسرت اور راقم کے ساتھ بزرگ شاعر و ادیب اور بلتی لغت کے خالق راجہ محمد علی شاہ صبا اور حاجی فدا محمد ناشاد کی

سرپرستی میں فارسی رسم الخط کے ساتھ بلتی قاعدہ کی تیاری پر کام شروع کردیا۔ خاصی محنت سے تیار کئے گئے اس قاعدے کو مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد نے شائع کیا۔ اس قاعدے کی اب تک دو ایڈیشیں شائع ہوچُکی ہیں اور مارکیٹ میں دستاب ہیں۔

بلتستان دائرہ مصنفین نے بلتی قاعدے کی کامیاب اشاعت کے بعد جماعت پنجم سے اُوپر کی کلاسوں کے لئے بھی بلتی زبان میں درسی کتابوں کی تیاری کو وقت کی ضرورت سمجھتے ہوئے اس پر کام کا آغاز کردیا۔ مالی وسائل نہ ہونے کے باوجود نصابی کُتب کے لئے مسودات کی تیاری اور اشاعت کے مُشکل کام کا آغاز کردیا۔

سال 2015 میں بلتی کی پہلی کتاب اور سال 2017 میں بلتی کی دوسری کتاب شائع ہو کر منظرعام پر آگئی۔ بلتستان دائرہ مصنفین اب بلتی کی تیسری کتاب کی تیاری کے ساتھ ساتھ کالج سطح کی کلاسوں کے لئے کُتب کی تیاری پر کام کررہا ہے۔ دوسری جانب بلتی ٹائپنگ کے مسئلے کے مستقل حل کے لئے بھی سرگرمی کے ساتھ کام جاری ہے۔ بلتستان دائرہ مصنفین کی کوششوں سے اب ایم ایس ورڈ کو ترتیب (Key Board) ز کے اُردو فونٹ کو استعمال میں لاتے ہوئے بلتی کے لئے مکمل کی بورڈ دیا گیا ہے جس میں بلتی زبان کے اضافی حروف کو بھی بڑی مہارت اور خوبصورتی کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ قراقرم انٹرنیشنل یونیورسٹی کے ایک طالب علم محمد اصغر کی یہ کاوش بہت ہی حوصلہ افزا ہے۔ اس میں یکساینت کے ساتھ تمام حروف ایک ساتھ اور ایک جیسے انداز میں لکھے جا سکتے ہیں۔ بلتی زبان کے لئے فارسی حروف تہجی میں جو سات حروف اضافی نقطوں کے ساتھ شامل کئے گئے۔

بلتستان دائرہ مصنفین کے تینوں بانی اراکین بلتی زبان و ادب کے فروغ کی جاری اپنی کوششوں کے تسلسل میں ایک طرف حکومتی سطح پر تو دوسری جانب پاکستان ریڈینگ پراجیکٹ کی وساطت سے بھی بلتی زبان کو تدریسی نصاب میں شامل کرنے اور بلتی میں سکولوں کے طلبا و طالبات کے لئے نصابی معاون کُتب کی تیاری میں بھی سرگرمِ عمل ہیں ۔اس ضمن میں بین الاقوامی اداروں سے کچی کلاس کے بچوں کے لئے کہانیاں لکھنے کی باقاعدہ تربیت حاصل کی اور کچی عمر کے بچوں میں کم عمری سے ہی مطالعے کا شوق پیدا کرنے کے لئے بلتی زبان میں کہانی کی کتابیں تیار کی ہیں جو کہ اب اشاعت کے مراحل میں ہیں۔

دوسری جانب 2016 کے وسط میں بلتستان کلچر فاونڈیشن کی ایک کانفرنس میں وزیر اعلیٰ گلگت بلتستان کی موجودگی میں بلتستان دائرہ مصنفین کی جانب سے پیش کردہ مطالبہ اور بعد ازاں گلگت بلتستان اسمبلی میں سکردو سے خاتون رکن اسمبلی ریحانہ عبادی کی تحریک پر منظور شدہ قرارداد

کی روشنی میں اب گلگت بلتستان کی زبانوں کی نصاب سازی کا عمل شروع ہوچُکا ہے۔ یوں گلگت بلتستان کی حکومت قاعدہ سے لیکر جماعت پنجم تک کے لئے مقامی زبانوں میں سلیبس کی کتابیں تیار کرنے کا کام متعلقہ مقامی زبانوں کے قلم کاروں اور ماہرین لسانیات پر مشتمل کمیٹیوں کے سپرد کر چُکی ہے۔

بلتی زبان میں سلیبس کی کتابوں کی تیاری کا کام ادیب و دانشور، بلتستان دائرہ مصنفین کے تینوں بانی اراکین انجام دے رہے ہیں۔ یوں اب بلتی زبان میں سرکاری سطح پر سلیبس کی کتابیں بھی اشاعت کے مرحلے سے گزر رہی ہیں۔ان جاری اقدامات کی روشنی میں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ بلتی زبان کا مستقبل محفوظ ہونے کی اُمید کی جاسکتی ہے۔

Q.NO.05

مختصراً یہ کہ آج سے تین (۳) ہزار سال پہلے اِس خطّۂ قدیم ''ملتان'' میں ''آسور'' قوم کی حکومت تھی، یہ دَور قبل اَز مسیح کہلاتا ہے، زمانے کے حالات و تغیّرات کے ساتھ ساتھ اِس خطّے اور اس کی ''بولی'' کا نام بھی بدلتا رہا۔ اِن تبدیل پذیر ناموں میں سے یہاں کی قدیم بولی کا نام پہلے ''آسورکی'' بعد میں ''آسُرکی'' پھر ''سَراواکی'' اور آخرِ کار موجودہ نام ''سرائیکی'' ہُوا۔ اِسی طرح دُنیا کے اس قدیم خطّے کا نام بھی ''مَلیُتھان''، مولتان اور پھر ''ملتان'' زبان زدِ عام ہُوا۔ یہ بھی یاد رہے کہ قبل ازیں ملتان بھی سر زمینِ ہند تھا اس خطّے کا قدیم کلچر ہندوازم پَر اُستوار تھا مگر جب ۹۳ ہجری میں محمّد بن قاسم کی یہاں آمد ہوئی تو تمام علم و اَدب کا مَحور مذہبِ اِسلام بن گیا اور غوث بَہَاءُالدین زکریا ملتانیؒ سے لے کر شاہ حسین خان لنگاہ،حافظ جمال اللہ چشتیؒ، منشی غلام حَسن شہیدؒ، پیر علی مَردان اَویسیؒ، حافظ مدد علی، خواجہ مُراد، عبدالرَّبّ علی افغانی شہید المعروف بابا غریب شاہؒ، قاضی احمد دین، مَولانا قائم الدین خان لنگاہؒ، مولانا نظام بخش قریشیؒ، خواجہ محمد عُبید اللہ ملتانیؒ، خواجہ محمد حسین بخش ملتانیؒ اور دیگر بے شمار عُلماء، صُلحاء، فُصحاء اور شُعراء نے سرائیکی زبان و اَدب کی مختلف حَوالوں سے بھرپور خدمت کی، چونکہ نشر و اَشاعت سے متعلق اَوزاری ذرائع اور وسائل میّسر نہ تھے اِس لیے زیادہ تر قلمی علمی ذخیرہ جمع کیا گیا تاکہ آنے والی نسلوں کے لیے راہ نُمائی کا ذریعہ بنے۔

اِسی طرح سرزمینِ ملتان کی قدیمی لائبریریوں، کتب خانوں، اور بعض علم دوست گھرانوں کی ذاتی ملکیّت میں قرآن پاک کے عربی متن کے ساتھ سرائیکی ترجمے موجود تھے، دیگر قیمتی قلمی کتب

ہزاروں کی تعداد میں موجود تھیں، جن میں سرائیکی زبان کی اِنشاء پردازی اور اس کی گرائمر کے بارے میں مُستند لُغّات (ڈکشنریاں) آج سے دو صدی قبل تک موجود تھیں۔

پُر اَمن فلاحی معاشرے میں دینی اقدار، مذہبی و ثقافتی روایات اور لسانیات و اَدب کو فروغ اور تحفّظ مِل سکتا ہے مگر جس معاشرے میں صورتِ حال بے یقینی ہو جائے اَمن کی جگہ بَد اَمنی کا دَور دَورہ ہو جائے تو وہاں اِن عواملِ خاص کا فروغ تو دَرکنار ان کا باقی رہنا بھی محال ہوجاتا ہے، یہی پریشان کُن صُورتِ حال سرائیکی خِطّہ، اس کے لوگوں، اور سرائیکی لِسانیات و اَدب کے ساتھ اُس وقت پیش آئی جب ۱۸۱۸ء میں سرزمینِ ملتان کے سکون کو سِکّھ شاہی دَور نے تاراج کیا، ملتان کے آخری مقامی معزّز فرمانرو نواب مظفر خان شہیدؒ کو پورے خانوادے سمیت تہہِ تیغ کر دیا گیا اور اعلانِ عام کر دیا گیا کہ مَساجد کو اصطبل بنا دیا جائے اور مسلمانوں کے علم و فن کو یکسَر تباہ کر دیا جائے۔ پھر کیا تھا سِکّھوں، ہندوؤں اور انکے گُماشتوں، لُوٹ مار کرنے والے خونخوار لوگوں نے سرائیکی خِطّے کے اَمن کو تہہ و بالا کر دیا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی دھرتی اور اِسلامی اقدار سے والہانہ پیار کرنے والوں کو تہہِ تیغ کر کے خون کی ندیاں بہا دی گئیں تو دوسری طرف کتب خانوں میں نَادر کِتابوں، قیمتی لِسانیاتی تحقیقی مَواد غرضیکہ قرآن پاک کے قلمی نسخُوں تک کو جلا کر خاکستر کر دِیا گیا۔ ایک بار پھر تاریخ کے اُس ہولناک واقعے کو دُہرایا گیا جو صلیبی جنگوں کے دوران ماضی میں مسلمانوں کے عظیم علمی و تحقیقی مرکز سپین کے ساتھ رُونما ہوا تھا۔ اُس وقت بھی مسلمانوں کے تمام علمی، اَدبی اور لِسانی آثار و کُتب خانے جلا دیئے گئے تھے۔ اِسی طرح سِکّھ شاہی دَور میں اِس سرائیکی خِطّہ کو اکتیس (۳۱) برس تک تاراج کیا گیا، اس کی ثقافت اور لِسانی تشخصّ کو بگاڑنے کے لیے تمام حربے استعمال کیے گئے۔

پھر ! ۱۸۴۹ء میں جب انگریزوں نے اس خِطّے پر چڑھائی کی تو رہی سہی کسَر اُنہوں نے نِکال دی۔ عید گاہ میں توپیں نصب کر کے گولے پھینکے گئے تو قلعہ ملتان تباہ ہو کر کھنڈر بن گیا۔ تقریباً ایک سَو سال تک بدیسی حکمرانوں نے ہمارے کلچر، زبان، حتّٰی کہ ہماری آزادی کو جی بھر کے پائمال کیا۔ تمام سرائیکی علاقوں کا مرکز قدیم زمانہ سے ہی ملتان رہا ہے۔ ڈیرہ غازیخان، جھنگ یا بہاولپور وغیرہ اس کے گرد و نواح شمار ہوتے تھے، تو ظاہر ہے ،کہ زمانے کی چیرہ دستیوں سے مجموعہ طور پر یہ خِطّہ اپنے لِسانیات و اَدب کے حوالے سے محروم و مغموم اور یتیم ہو کر رَہ گیا۔ یہ جو کچھ قدیم قَلمی سَرائیکی اَدبی لٹریچر زمانے کی دَست بُرد سے بَچ گیا تھا وہ اَصل علمی خزانے کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہے، یہ بھی اِسی طرح سے بچ گیا کہ یا تو لوگوں (عِلمی گھرانوں) کے پاس ذاتی طور پر محفوظ تھا یا پھر ملتان کے نواحی علاقوں میں تھا۔ جھنگ، یا ریاست بہاولپور میں نواب

صاحب کی ذاتی مِلکیّت یا اِرد گرد کے علاقوں کی لائبریریوں میں محفوظ تھا۔ تین چار صَدیوں پہلے تک کا یہ قلمی سرائیکی عِلمی اَدبی سرمایہ آج بھی ضلع ملتان کے بعض گھرانوں یا مندرجہ ذیل کے پاس نہ صرف مَوجود و محفوظ ہے بلکہ ایک زمانہ اِستفادہ بھی کر رہا ہے:

۱۔سَردار جھنڈیر لائبریری موضع جھنڈیر تحصیل میلسی ضلع وہاڑی، اِس لائبریری کے مہتمم صاحبان علم پَروَر اور دوسروں تک فیض پہنچانے والے لوگ ہیں۔ [1]

۲۔حکیم اَللہ بخش المعروف علامہ اَسد نظامی چک R 14-10 نزد جہانیاں۔ [2]

۳۔جناب حبیبؔ فائق سرپرست اِدارہ فروغِ سرائیکی و پنجابی، ملتان۔

۴۔پبلک لائبریری باغ لانگے خان ملتان، وغیرہ علاوہ اَزیں بہاولپور، ڈیرہ غازیخان یا جھنگ اور ملک بھر کی دیگر لائبریریوں میں خصوصاً سیٹھ عُبیدالرحمٰن صاحب کی بہاولپور، شاہین کہروڑی (لودھراں)، کی ذاتی لائبریری میں بھی سرائیکی اَدب کا بَچا کُھچا سَرمایہ موجود ہے۔ [3]

سرائیکی زبان کی وُسعت کا کمال دیکھیں کہ اِس میں مُلحقہ علاقائی لہجے بدلنے کی صلاحیّت بدرجہ اتم موجود ہے اِس ضمن میں یہ جان لینا اَز بس ضروری ہے کہ مختلف علاقوں کی آب و ہَوا، اور بَسنے والے لوگوں کی بُود و باش کے باعث محض لہجے میں علاقائی تبدیلی واقع ہوتی ہے جس سے سرائیکی زبان کا لہجہ بنتا سَنورتا ہے۔ یہ عوامی رَدِّ عمل ہے جو صدیوں سے جاری و ساری ہے۔ اِس ضمن میں راقم کی ایک رُباعی سرائیکی زبان میں ملاحظہ فرمائیں جو سرائیکی زبان کے مختلف علاقائی لہجوں کی تشریح کے طور پر لِکّھی گئی ہے:

لہجے وَکھرے وَکھرِنْ یار، زُبان سَرائیکی ہِکْ ہِے
بِنّھاں بولیاں آلیاں کُوں اِیں بولی دِی سِکْ ہِے
مُلتانیؔ، ڈیرویؔ لہجہ ہُووِے، ریاستی بھانویں جھنگوی
مِٹھڑی بولی ہِے سرائیکی سَب کُوں پوندی چِھک ہِے

تو ثابت ہُوا کہ سرائیکی زبان سے مُراد تمام علاقائی لہجے ہیں اور مختلف علاقوں کے دانشور اور محقق بغیر کسی احساسِ کمتری کے اپنی مادری زبان و لہجہ کو فروغ دے رہے ہیں اور رسم الخط بھی (سرائیکی لکھنے کے لیے) کم از کم پاکستان میں وجہِ نزع نہیں ہے مقصد تحریر کرنا ہوتا ہے، کسی بھی زبان کی ایسی تحریر جو پڑھنے والوں کے لیے باعثِ ابلاغ ثابت ہو۔ یوں اس قرآن پاک کا ترجمہ سرائیکی زبان کے بہاولپوری (ریاستی) لہجے کی نمائندہ کرتا ہے۔ قبل ازیں خواجہ عُبید اللہ ملتانیؒ نے ۱۲۴۰ ہجری میں قرآنِ پاک کا سرائیکی ترجمہ کیا تھا جو قلمی نسخہ کی صورت میں موجود تھا، اسی طرح قدیر آباد ملتان ہی کے مولانا عبدالتّوابؒ نے ۱۲۷۰ ہجری میں مکمل ترجمہ کیا

یہ بھی قلمی نسخہ بنا جبکہ اوّل و آخر دو پارے طبع بھی ہوئے، مولانا دُرّ محمد صاحب تونسویؒ خلیفہ حضرت خواجہ محمد شاہ سلیمان تونسویؒ نے ۱۲۶۵ہجری میں سورۃ یٰسینؒ، سورۃ الرحمٰن، سورۃ یوسف، سورۃ ملک اور سورۃ کہف کے ساتھ ساتھ قرآنِ پاک کے آخری پارہ کا بھی سرائیکی ترجمہ کیا جو موجودہ کُتب خانہ سلیمانیہ تونسہ شریف میں موجود ہے۔

حبیبؔ فائق صاحب کے بقول نواز کاوِش کے حوالہ سے ایک سو سالہ مطبوعہ قدیم نسخہ پُرانی سرائیکی جِسے انگریز شاہپوری زبان کہتے تھے دیکھا گیا ہے۔ اِسی طرح مولوی حفیظ الرحمٰن بہاولپوری کا سرائیکی ترجمہ والا بڑی تقطیع کا مطبوعہ قرآن پاک بھی قابلِ دید ہے جو کہ سیٹھ عبدالرحمٰن صاحب کے ہاں دیکھا جا سکتا ہے، پھر ملتان میں ڈاکٹر مہر عبدالحق سومرہ نے قرآن پاک کا مکمل سرائیکی ترجمہ کیا جو ۱۴۰۴ہجری میں پاکستان قومی ہجرہ کونسل (اِسلام آباد) کے مالی تعاون سے سرائیکی اَدبی بورڈ ملتان کی سعی سے شائع ہُوا۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق نے اغلاط نامہ مُرتّب کر کے مدرسہ انوار العلوم کی انتظامیہ کے (قرآنی نسخوں سمیت) سپرد کیا کہ وہ یہ اَغلاط نامہ شائع کرا کے شائقین کو قرآن پاک کے ہمراہ دیا کریں۔

پڑھنے والوں کی دلچسپی کے لیے ایک اور اہم بات بتلا دوں جو کہ بڑی قابلِ غور ہے۔ آپ نے اکثر احباب کو یہ کہتے ہوئے سُنا ہوگا کہ ''سرائیکی ایک میٹھی زبان ہے'' تو کبھی کسی نے اِس اَمر پر غور کیا کہ اِس میں مِٹھاس کِس شکر (چینی) سے آئی ہے؟

اِس ضمن میں یہ واضح کر دینا از بس ضروری ہے کہ ہم نے اپنے اِس مضمون میں جن اضافی نقطوں والے حروف کا ذِکر کیا ہے کہ ان کا صَوتی اَثر بدلنے کے لیے انہیں جس نَرم خُوئی سے اَدا کرنا ہوتا ہے زبان کی وہی لوچ ہی مٹھاس کا درجہ رکھتی ہے، چونکہ زبان سے لفظوں کی ادائیگی میں سختائی ختم ہوجاتی ہے نتیجتاً سرائیکی زبان بولنے میں ایک مٹھاس سی پیدا ہوجاتی ہے جو سُننے والوں کی سماعت میں رَس گھولتی ہے، اِسی لیے نہ صرف یہ جملہ عرفِ عام میں کہا جاتا ہے بلکہ اس کُلّیئے کی بِناء پر حقیقتاً یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ واقعی سرائیکی ایک میٹھی زبان ہے۔ تو لیجئے اِس ضمن میں راقم کا ایک سَرائیکی شعر پڑھ لیجئے:

چیکُوں سُنڑ تے اُکھڑی نِندر کُوں آندی ہے پَئی لولِی
لارَیب ہے اُو خَواجہ سَئینؒ دی مِٹھڑی سَرائیکی بولی

سرائیکی زبان میں تشبیہات اور اِستعارات کی چاشنی، خیالات کی خوشبو، کلاسیکل رِدَم، نَرم خُوئی کے باعث کانوں میں رَس گھولتی شیرینی، الفاظ و معانی کی وُسعت اور فصاحت و بلاغت کا ایک سمندر موجزن ہے۔ لیکن جب ہم احساسِ کمتری یا روایتی بے توجّہی کے باعث اَپنی مادری زبان کو

اپنے بچوں کے ساتھ گریز کی پالیسی اَپنائیں گے تو اپنی آنیوالی نسلوں کے ساتھ بہت بڑا ظلم کریں گے۔

حضرت سلطان باہوؒ کا صوفیانہ کلام فیض مدام سرائیکی زبان کے جھنگوی لہجے کا بے مثل شاہکار ہے۔ اِسی طرح حضرت بابا فرید شکر گنجؒ کا کلام سرائیکی کے پنجابی لہجے کا، تو تاجدارِ سرائیکی حضرت خواجہ غلام فریدؒ (کوٹ مٹھن) کا عارفانہ کلام جو کہ ''دیوانِ فرید'' کی صورت میں یکجا کیا گیا ہے سَرائیکی زبان کے ملتانی، ڈیروی اور ریاستی (بہاولپوری) لہجوں کے اِشتراک کا عظیم شاہکار ہے جو کہ سَرائیکی زبان کی صورت میں یَکجا کیا گیا ہے سَرائیکی زبان کے ملتانی، ڈیروی اور ریاستی (بہاولپوری) لہجوں کے اشتراک کا عظیم شاہکار ہے جو کہ سرائیکی زبان کی اصل معراج ہے یہ بات اَغلب ہے کہ خواجہ صاحب کے کلام میں سرائیکی کا قدیم ملتانی لہجہ غالب ہے جبکہ ان کے استعارے سابق ریاست بہاولپور کے خطہ روہی، تھل وغیرہ کے معروف و مذکور ہیں۔

زیرِ مطالعہ قرآن پاک ہٰذا کا سرائیکی ترجمہ بہاولپوری (ریاستی) لہجہ کی سرائیکی کا نمائندہ ہے جو کہ نہایت سہل اور سَادہ انداز کا بھی حامل ہے۔ پروفیسر دِلشاد کلانچوی (مرحوم) نے حَتُی الاِمکان ترجمے کا حق اَدا کرنے کی اپنے تئیں پُوری کوشش کی ہے۔، مترجم کی سرائیکی زبان و اَدب سے والہانہ محبت یہ بات ثابت کرتی ہے کہ انہوں نے متذکرہ بالا صُوفیاءِ کرام کے رُوحانی تصّرف کو اپنے وِجدان کے ذریعے آشکار کیا ہے، اور تمام پاکیزہ جذبوں کو یکجا کر کے کلامُ اللہ کے ترجمے کا فریضہ سر اَنجام دیا ہے۔ جو طریقہ راقم نے قبل ازیں لکھ دیا ہے اگر اُسے پیشِ نظر رَکھ کر پڑھیں تو مجھے یقینِ کامل ہے کہ ہر خواندہ شخص اس ترجمے کو بآسانی پڑھ کر قرآنِ کریم کے مفہوم و مطالب کو سمجھ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن پاک پڑھنے اور اسے صحیح معنوں میں سمجھنے کی توفیق و استطاعت نصیب فرمائے۔